UNIVERSAL
LIBRARY
OU_222940
UNIVERSAL
LIBRARY

OUP—1700—8-11-77—7,000.

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ۸۹۱۵ د ۳۰۵ Accession No. P. 932

Author اردو

Title اردو رسالہ
جلد ششم ۲۴

This book should be returned on or before the date last mai

اُردو

جلد ششم　　　　　　　　　　　　　　　　　　حصۂ بست و چہارم

اکتوبر سنہ ۱۹۲۶ع

انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن)

کا

سہ ماہی رسالہ

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱	تنقید شعرالعجم	مولانا حافظ محمود خاں صاحب شیرانی پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور	۵۵۹
۲	تجدد ادبی ایران	مولوی سید وہاج الدین صاحب بی' اے' بی' ٹی' اورنگ آباد کالج	۶۰۳
۳	بجنوری مرحوم کی وفات پر (نظم)	مولوی سید ہاشمی صاحب رکن دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن	۶۴۳
۴	کیا کتب خانۂ اسکندریہ عربوں نے جلایا؟	جناب سید حسن صاحب برنی' بی' اے' ال' ال' بی	۶۴۵
۵	یاد نشاط (نظم)	مولوی غلام طیب صاحب بی' اے' بی' ٹی' اورنگ آباد کالج	۶۶۳
۶	مقدمۂ مثنوی خواب و خیال	مولوی عبدالحق صاحب بی' اے' اڈیٹر	۶۶۷
۷	بادۂ کہن (میرحسن) (نظم)	〃 〃 〃 〃	۶۸۱
۸	تبصرے	اڈیٹر و دیگر حضرات	۶۸۵

تنقید شعرالعجم

جلد دوم

(از جناب پروفیسر محمود شیرانی صاحب)

قوله' "اس کے بعد چنگیز خاں کا پوتا ھلاکو بن تولی' بن چنگیز خاں تخت نشین ھوا' ھلاکو نے محقق طوسی کو وزارت کا منصب دیا' رفتہ رفتہ مسلمانوں نے دربار پر قبضہ کر لیا' یہاں تک کہ اُس کا بیٹا نکودار دار خواجہ شمس‌الدین وزیر سلطنت کی ترغیب سے مسلمان ھو گیا اور اپنا نام احمد رکھا۔ ترک اِس پر بگڑ گئے اور ارغوں خاں (ھلاکو خاں کا دوسرا پوتا) کی افسری میں احمد خاں کو گرفتار کر کے سنہ ۶۸۰ میں قتل کر دیا"—

(شعرالعجم' جلد دوم' صفحہ ۲ معارف پریس' اعظم گڈھ)

محقق طوسی کی وزارت کا قصہ کسی اصلیت پر مبنی نہیں ھے اور تاریخیں متفق ھیں کہ ھلاکو کا پہلا وزیر امیر سیف‌الدین بیتکچی بہادر بن عبداللہ خوارزمی ھے' جو بحیثیت وزیر سنہ ۶۵۳ھ میں ھلاکو کے ساتھ ھی ایران میں آتا ھے اور فتح بغداد کے بعد نجف اشرف کی حفاظت کے لیے ھلاکو سے سو مغولی سپاھی مانگتا ھے۔ سنہ ۶۶۱ھ میں جب ھلاکو برکہ خاں پادشاہ قبچاق کی جنگ کے لیے جاتا ھے' وزیر موصوف دشمنوں کی بد گوئی کی بنا پر خان کے حکم سے ھلاک کر دیا جاتا ھے۔ اِس واقعہ کے بعد صاحب دیوان شمس‌الدین محمد جوینی منصب وزارت پر سرفراز ھوتے ھیں اور مستقلاً ۲۲ سال برابر یعنے باقی ایام

هلاکو و کامل عہد اباقا خاں و سلطان احمد اِس عہدۂ جلیلہ پر ممتاز رہتے ہیں - خود محقق طوسی نے کتاب اوصاف‌الاشراف صاحب دیوان کے نام پر اور کتاب ترجمۂ ثمرۂ بطلیموس ان کے فرزند خواجہ بہاءالدین محمد حاکم اصفہان کے نام پر لکھی ہے - سلطان احمد کا اصلی نام تکدار، توکدار، یا تکودار ہے - نہ نکو دارادار - وہ سنہ ۶۸۰ھ میں قتل نہیں کیا جاتا، کیونکہ سنہ ۶۸۱ھ میں تخت نشین ہوتا ہے اور دو سال اور دو ماہ حکومت کرنے کے بعد سنہ ۶۸۳ھ میں ہلاک کیا جاتا ہے - ترکوں کی مخالفت سلطان احمد کے ساتھہ مذہبی بنا پر نہیں تھی، بلکہ زیادہ تر سیاسی تھی - اگر مذہب کا سوال درمیان میں ہوتا تو شاید احمد کو تخت ہی نصیب نہ ہوتا، کیونکہ وہ تخت نشینی سے پیشتر ہی حلقہ بگوش اسلام تھا اور دربار کے تمام شہزادے اور طاقتور امیر کافر تھے - دوسرے دعویداروں کے باوجود سب کے اتفاق سے سلطان احمد پادشاہ بنایا جاتا ہے - ارغون، ہلاکو کا سب سے بڑا پوتا اور اباقا خاں کا فرزند اکبر ہے وہ باپ کے تخت کا دعویدار رہا - احمد نے کئی لڑائیوں کے بعد بصد خرابی بصرہ میں اُس کو گرفتار کیا اور قتل کرنے کے بجاے قید کر دیا - ارغون کے طرفداروں نے جن کی ایک طاقتور جماعت دربار میں بھی موجود تھی، قید کی پہلی ہی رات سازش کر کے اُس کو آزاد کر دیا اور احمد کے طرفداروں کو قتل کر کے ارغون کو پادشاہ بنا دیا —

قولہ، ''سلطان ابوسعید کے عدل و انصاف اور نظم و نسق کے قواعد اور آئین، مساجد اور مدارس پر کندہ ہو کر، مدتوں قائم رہے، یہاں تک کہ اوحدی کرمانی نے جو مشہور صوفی گزرے ہیں اپنی مثنوی جام جم میں ابوسعید کی اِس طرح مدح سرائی کی ہے :—

دو جہانرا صلاے عید زدند سکہ بر نام بوسعید زدند
در چمن گفتہ بلبل و قمری مدح این گلبن اولوالامری''

(شعرالعجم صفحہ ۲)

مصنف جام جم کے' مشہور صوفی ' ہونے کا اندازہ اس ایک امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ خود علامۂ شبلی اس سے ناواقف ہیں - شیخ اوحدی کرمانی (اوحدالدین حامد کرمانی) سنہ ٦٩٧ ہجری اور سلطان غازان کے عہد میں وفات پاتے ہیں - مثنوی جام جم سنہ ٧٣٣ ہجری میں تصنیف ہوتی ہے' چنانچہ شعر :—

چوں بتاریخ بر گرفتم فال   ہفتصد رفتہ بود سی وسہ سال

(جام جم قلمی)

درحقیقت اس مثنوی کے مصنف رکن الدین اوحدی مراغی ثم الاصفہانی ہیں ' جو شیخ اوحدالدین کرمانی کے مرید ہیں اور سنہ ٧٣٨ ہجری میں انتقال کرتے ہیں —

قولہ' " تاتار کے قتل عام میں جو بیشمار جانیں ضائع ہوئیں اُسنے مسلمانوں کے شجاعانہ جذبات کو فنا کردیا ' اس کا شاعری پر یہ اثر ہوا کہ رزمیہ نظمیں ہمیشہ کے لئے معدوم ہوگئیں' شاعری کے فرائض پورے کرنے کے لئے متعدد رزمیہ مثنویاں لکھی گئیں مثلاً :-

(ہمائے ہمایوں خواجوے کرمانی) ' (آئینۂ اسکندری امیر خسرو) ' (سکندر نامۂ جامی)' (تیمور نامۂ ہاتفی) ' (شاہنامۂ قاسم گونا بادی) ' (اکبر نامۂ فیضی) لیکن صاف نظر آتا ہے کہ کہنے والے منہ چڑھاتے ہیں' دل میں کچھ نہیں -"

(شعرالعجم صفحہ ٣)

اِس سے پیشتر سامانی' غزنوی اور سلجوقی دوروں کا مذکور ہوچکا ہے اِن دوروں میں مسلمانوں کے شجاعانہ جذبات کا شاعری پر کوئی اثر نہیں دکھایا گیا ہے ' جس کا اب تاتاري قتل عام سے فنا ہوجانا بیان کیا جاتاہے مولانانےابتک صرف تین رزمیہ کتابوں یعنے شاہنامہ'گرشاسپ نامہ اورسکندرنامہ کا زیادہ تر ادبی حیثیت سے ذکر کیا ہے اور میں یقین نہیں کرسکتا کہ اِن کتابوں

نے مسلمانوں کے جنگی و قومی جذبات کے بر انگیختہ کرنے یا اُن کے بیدار رکھنے میں کوئی مدد کی ہو' کیوں کہ انکی تمام داستانیں غیر مذاهب کے جنگ آزماؤں سے تعلق رکھتی هیں - رستم سیستانی تھا' کیخسرو کیانی ' سکندر یونانی اور نوشیرواں ساسانی —

فارسی میں رزمیه شاعری محض اتفاقیه رائج هوئی هے' ایرنیوں کو اپنے قومی افسانے اور تاریخ سے شغف تھا فردوسی نے اُس کو نظم کردیا ' اسدی نے ایک اور داستان جس کے واسطے وہ کہتا هے که: فردوسی کو نهیں ملی' گر شاسپ نامه کے نام سے نظم کردی- ملکی اور مذهبی اثرات میں همارے هاں تقلید پسندی کا زور هے' اسی طرح اسلامی ادبیات کے تمام دوروں میں بھی یہی ایک اصول یعنے تقلید صراحت کے ساتھه نمایاں هے' شاعر اپنے تفنن طبع کے لئے کسی نه کسی کا ضرور تتبع کرتے رهے هیں - نظامی کے دور تک' فردوسی کی تقلید کرتے رهے' چنانچه بهمن نامه ' شهر یار نامه وغیرہ شاهنامه کی تقلید میں لکھے گئے- جب نظامی نے اپنی طرز کا اعلیٰ معیار پیش کیاتو تمام صنعت پرست اُن کی طرف جھک گئے —

چنگیزیوں کے بعد تو مقابلتاً زیادہ رزمیه کتابیں لکھی گئي هیں- مولانا کی فهرست ابھی نا تمام هے اور میں ذیل کے نام اضافه کرتا هوں:—

مفتاح الفتوح امیر خسرو' جس میں جلال الدین فیروز شاہ خلجی کی جنگ کا ذکر هے- خاور نامۂ ابن حسام (سنه ۸۳۰ هجری)' تغلق نامۂ بدر چاچی ' جس میں بیس هزار کے قریب اشعار تھے ؛ بهمن نامۂ آذري —

فتوحات جمالی شستری (سنه ۹۹۴ هجری)' شاهرخ نامۂ قاسمی گونابادی' ظفر نامۂ حمدالله مستوفی سنه ۷۳۵ هجری ؛ شهنشاہ نامۂ احمد تبریزی سنه ۷۳۸ هجری ' ظفر نامه کے اشعار کی تعداد پچھتر هزار هے' یعنے شاهنامۂ فردوسی سے بھی پندرہ هزاراشعار زائد هیں- تاهم مولانا شبلی فرماتے هیں که:

"رزمیہ نظمیں ہمیشہ کے لئے معدوم ہوگئیں اور اُنھوں نے محض شاعری کے فرائض ادا کئے ہیں" خسرو، حمداللہ مستوفی، جامی اور ہاتفی کے لئے یہ کہنا کہ محض منہ چڑایا ہے، کسی حالت میں صحیح نہیں مانا جا سکتا۔ مولانا کے نزدیک رزمیہ شاعری کے ضروری اوصاف یہ ہیں: (۱) واقعہ مہتم بالشان ہو (۲) لڑائی کے ہنگامہ کا بیان پر رعب ہو (۳) جنگ کے ساز و سامان، رزم آزماؤں کی لڑائی کے تمام داؤں پیچ بتائے جائیں وغیرہ۔ میں کہتا ہوں کہ گزشتۂ بالاشعرا میں سے ہر ایک نے قریب قریب ان فرائض کو ادا کیا ہے، لیکن پھر بھی مولانا شبلی فرماتے ہیں:—

اگر چہ شیخ نے ڈاڑھی بڑھائی سن کی سی
مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی

"ہمائے ہمایوں" ایک عشقیہ نظم ہے، جس میں شہزادۂ ہمائے، والی خاور اور شہزادی ہمایوں دختر فغفور چین کے عشق و محبت کا فرضی قصہ ہے، اس لئے اِس کو رزمیہ نظموں سے کوئی تعلق نہیں —

قولہ " جنگی جذبات کے فنا ہونے نے طبیعتوں میں انفعالی اثر زیادہ پیدا کیا، جو تصوف کے سوا، ایک اور رنگ میں ظاہر ہوا یعنے غزل گوئی، یہ مسلم ہے کہ غزل جس چیز کا نام ہے اُس کی ابتدا شیخ سعدی اور اُن کے معاصرین سے ہوئی "—

(شعرالعجم صفحہ ۴)

جنگی جذبات کی معدومیت اگر ایران میں غزل کے وجود کی ذمہ‌دار ہے تو آخر اس عہد کے ہندوستان کو کیا ہوا تھا؟ یہ ملک چنگیزی سیلاب سے بالکل مامون رہا ہے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ یہاں بھی خسرو اور حسن دہلوی جیسے غزل گو موجود ہیں۔ تصوف مغلوں کی آمد سے پیشتر اکثر ممالک اسلام میں موجود تھا، البتہ اُن کی آمد نے اُس کی ترقی کی رفتار کو تیز

کر دیا اور یہ تصوف ہے، جس نے غزل گوئی کو حقیقی ترقی دی ہے—

قولہ، ''کم از کم پچاس ساٹھہ آدمی ایک دم سے فنا ہو گئے، اِن امور نے دنیا کی بے ثباتی اور انقلابات کا ایسا نقشہ کھینچ دیا جو مدت تک آنکھوں کے سامنے پھرتا رہا، اِس بنا پر دنیا کی بے ثباتی کے مضامین زیادہ تر اشعار میں آنے لگے - شیخ سعدی، ابن یمین، خواجہ حافظ کے ہاں اِن مضامین کی بہتات اسی بنا پر ہے، اِن لوگوں نے یہ سماں خود آنکھوں سے دیکھا تھا، وہی زبان پر آیا''—
(شعرالعجم صفحہ ۴)

دنیا کی بے ثباتی، مشرق کے اکثر مذاہب کا ایک وقیع موضوع رہا ہے، جس کو اِن ممالک کی غیر مستقل طرز حکومت نے اور بھی ممتاز حیثیت دیدی ہے - اسلام میں اِس کی تلقین کی آیات کلام پاک میں موجود ہیں - تصوف نے اپنے اصولوں کو اسی مضمون کی اساس پر قائم کیا ہے - ایرانی شعرا میں سب سے پیشتر محمد بن وصیف سجزی اس موضوع کو اپنی شاعری میں روشناس کرتا ہے - رودکی، ناصر خسرو، سنائی، انوری اور خاقانی بغیر کسی استثنا کے یہی بولیاں بول رہے ہیں، لیکن یہ فردوسی، خیام اور عطار ہیں، جن کے ہاں قدم قدم پر یہی درس عبرت دیا گیا ہے - سعدی، ابن یمین اور خواجہ حافظ اس بارے میں کسی خاص امتیاز کے مستحق نہیں - در حقیقت اگر کوئی شاعر اس انقلاب سے کسی قدر اثر پذیر ہوا ہے تو وہ کمال اسمعیل ہے—

——شیخ فریدالدین عطار——

میں رفع تشکیک کی غرض سے ابتدا ہی میں گذارش کیے دیتا ہوں کہ علامۂ شبلی، شیخ عطار کو بار بار خواجہ عطار لکھہ رہے ہیں - ہم خواجہ کا لفظ آج کل بھی ہر شخص کے نام کے ساتھہ استعمال نہیں کر سکتے، چہ جائیکہ اُن ایام میں - قدما میں خواجہ کے واسطے کسی قسم کی تعمیم نہیں مانی گئی ہے، وہ خاص خاص طبقے کے لوگوں کے نام کے ساتھہ ملتا ہے، مثلاً: اصحاب مناصب و دبیران

سلطانی کے ناموں کے ساتھ - علاوہ بریں ''خواجہ عطار'' کے لقب سے ایک اور بزرگ جو نویں صدی ہجری میں وفات پاتے ہیں، ممتاز ہیں' اُن کا پورا نام خواجہ علاءالدین عطار ہے —

فقیر کے واقعہ کے ذکر کے بعد جس کی نا گہانی وفات سے متأثر ہو کر شیخ فریدالدین عطار اپنی دکان لٹا دیتے ہیں، مولانا شبلی فرماتے ہیں:

''لیکن افسوس ہے کہ ہمارے تذکرہ نویسوں نے خود خواجہ صاحب کی تصنیفات نہیں پڑھیں' اُن کی کتابوں سے ثابت ہوتا ہے کہ تصوف اور فقر کے کوچے میں آنے کے بعد وہ اپنے قدیم پیشہ میں مشغول رہے اور اُسی حالت میں اسرار و عرفان کی حقائق پر کتابیں لکھتے رہے'' —

(شعرالعجم صفحہ ۸ مطبع معارف اعظم گڈھ)

میں اس قدر اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ شیخ عطار کی عمر میں تصوف و عرفان سے ذوق آشنا ہونے کا انقلاب کسی بیرونی تحریک یا واقعہ کی بنا پر نہیں ہوا اور نہ یہ تبدیلی اُن کی عمر کے کسی خاص وقت میں ہوئی' بلکہ وہ ابتدا ہی سے بنابر تقاضاے طبعی حضرات صوفیہ کے معتقد اور منازل سلوک و عرفان کے سالک تھے' چنانچہ تذکرۃالاولیاء کے دیباچہ میں ارشاد کرتے ہیں:

''دیگر باعث آں بود کہ بے سببے از کودکی باز دوستی ایں طائفہ در جانم موج میزد و ہمہ وقتے مفرح دل من از سخن ایشاں بود' براے آنکہ المرء مع من احب'' —

(تذکرۃالاولیاء صفحہ ۵ مرتبۂ پروفیسر نکلسن)

رہا فقیر کا قصہ' وہ صرف اس کی نوعیت کی بنا پر تسلیم یا رد کیا جا سکتا ہے - لیکن یہ خیال کرنا کہ تمام اہل تذکرہ اس پر متفق ہیں' صحیح نہیں' کیونکہ محمد عوفی اور حمداللہ مستوفی اس کا ذکر نہیں کرتے - عطار کے عہد سے قریباً تہائی سو سال بعد سلطان حسین میرزا کے عہد کے مصنفین' جن میں مولانا

جامی اور دولت شاہ قابل ذکر ھیں' اس کا تذکرہ کرتے ھیں اور بعد کے تذکرہ نگار اُن کے مقلد ھیں - لیکن خود مولانا جامی اور دولت شاہ اس قصے کے ضمنی واقعات اور سوال و جواب پر متفق نہیں ھیں - بھر کیف میرے نزدیک شیخ عطار کے سوانح میں اِس قصہ کے لیے کوئی مناسب موقعہ نظر نہیں آتا' کیونکہ اول تو وہ خود ھی ایام طفلی سے اصحاب ذوق و عرفان کی صحبت کے مائل تھے - دوسرے جہاں تک معلوم ھے' جیسا کہ مولانا بھی معترف ھیں' شیخ عطار فقر و تصوف کے ساتھہ ساتھہ مطب اور دارو خانہ کا سلسلہ جاری رکھتے ھوے "دل بیار و دست بکار" پر عامل رھے —

قولہ "خواجہ صاحب کی تحریروں سے یہ بھی ثابت ھوگیا کہ اس عالم میں اُنھوں نے مدت تک سیاحی بھی کی ھے - لسان الغیب میں کہتے ھیں:-

"چار اقلیم جہاں گردیدہ ام ....
سر بر آوردہ بہ محبوبی عشق سیر کردہ مکۂ و مصر و دمشق
کوفۂ وری تا خراساں گشتہ ام سیحن و جیحونش را ببریدہ ام
ملک ھندوستان و ترکستاں زمیں رفتہ چوں اھل خطا از سوے چیں
عاقبت کردم بہ نیشا پور جاے ارفتاد از من بعالم ایں صداے
در نشا پورم بہ کنج خلوتے با خداے خویش کردم وحدتے"

(شعرالعجم ص ۱۰)

میرا عقیدہ ھے کہ مولانا شبلی نے لسان الغیب بچشم خود نہیں دیکھی ھے' بلکہ ابیات بالا مرزا محمد بن عبدالوھاب کے دیباچۂ و تذکرۃالاولیاء عطار' مرتبۂ پروفیسر نکلسن سے نقل کرلیے ھیں اور ایسے اشعار کو ترک کر دیا ھے' جن سے شیخ عطار کی شیعیت کا اذعان ھوسکے - مثلاً:-

"شہر شاپورم تولد گاہ بود در حرم گاہ رضا ام راہ بود
مرقد اثنا عشر رفتم بچشم میزنم بردشمنانش سنگ پشم"

اس دیباچے میں اِسی لسان‌الغیب سے میرزا محمد نے عطار کی شیعیت کے ثبوت میں یہ اشعار بھی حوالۂ قلم کئے ہیں :—

"شیعۂ پاکست عطار اے پسر　　جنس ایں شیعہ بجانِ خود بخر
ما ز فاروق التجا برکندہ ایم　　پے ز نورین شما ببریدہ ایم
بو حنیفہ را ز دست بگذار تو　　خود برو اندر پئے کرار تو

(تذکرۂ اولیا طبع بر یل سنہ ۱۲۲۲ ھجری صفحۂ یب)

لسان‌الغیب اگرچہ میری نظر سے نہیں گزری ہے، تاہم اس قدر عرض کئے بغیر نہیں رہسکتا کہ ہمیں اس کتاب کو عطار کی طرف منسوب کرنے میں بہت کچھہ تامّل اور تردد سے کام لینا چاہئے - یہ کتاب اس‌قدر نا معلوم ہے کہ جب تک ڈاکٹر ایتھے نے انڈیا آفس کے کتب‌خانہ کی فہرست ترتیب دےکر شایع نہکی، اُس وقت تک کوئی اُس سے واقف نہ تھا - سب سے پہلے میرزا محمد قزوینی نے اِس کا ذکر کیا ہے اور علامہ شبلی دوسرے شخص ہیں جو اِس کا نام لیتے ہیں —

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ لسان‌الغیب کے مصنف نے اپنی شیعیت کے اظہار میں ایک کتاب مظہر العجائب حضرت علی کرم‌اللہ وجہ کے نام پر لکھی تھی، جس میں اُن کی مدح میں مبالغہ انگیزی کے علاوہ نواصب، روافض و خوارج پر، جن سے اس کی مراد اہل سنت وجماعت ہیں، جاؤ بیجا حملے کئے تھے - کسی فقیہہ نے جو سمرقندی ہے، مصنف پر رفض کا الزام لگا کر مظہرالعجائب کو جلوادیا ارر خود اس پر قتل کا فتویٰ لگا کر سزا دہی کا حکم دیدیا - عوام‌الناس ایک لاکھہ کی تعداد میں جمع ہوگئے، اُس کا گھر لوٹ لیا گیا اُس کے فرزند کو قید کردیا اور قریب تھا کہ اُس کی جان ضائع ہوجاے، اتنے میں خداے تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے اپنی برہان دکھائی، غیب سے اِس کے کانوں میں آواز آئی کہ :اے عطار خوف نہ کہا، اِن ظالموں کے ہاتھوں سے

تو فوراً رہا ہوجا ئیگا - اِس الہام کے بعد اُس کے پرِ پرواز پیدا ہوگئے اور مصنف مرغ تیز پر کی طرح اُڑتا ہوا لوگوں کی آنکھوں سے غائب ہوگیا:

با لہا مم ندا درداد یزداں
که اے عطار تو خود را مترساں

خلاصی ایں زماں از دست ایشاں
ازیں معنی مکن خاطر پریشاں

پریدم ازمیاں شاں چشم کُن باز
بالہام الٰہی ہمچو شہباز

(مظہرالعجائب قلمی)

اِس وقعه کے بعد مصنف وطن سے آوارہ ہوکر مکّہ چلا جاتا ہے اور وہاں کتاب لسان الغیب تصنیف کرتا ہے :—

ایں لساں از پیش احمد گفته‌ام
در مقام مکه اش بنوشته ام

(از مقدمۂ میرزا محمد قزوینی)

لسان الغیب گویا اِس ماحول میں پیدا ہوتی ہے ؛ اب اُس کو شیخ فریدالدین عطار کی طرف منسوب کرنا، جو مذهب سنت و جماعت کے پیرو ہیں ' جیسا که اُن کی تصنیفات سے ظاہر ہے، میں کہتا ہوں سخت ظلم ہے - علی هذا اس کتاب کی بنا پر شیخ کی سیاحی کا دعوی بھی میرے نزدیک نا قابل قبول ہے کیوں که وہ اِس حصۂ ادبیات مجعول سے تعلق رکھتی ہے، جو شیخ عطار کے نام پر موضوع ہوا ہے- لیکن اِس کے متعلق آیندہ بحث ہوگی—

قو له "خواجه صاحب نے اگرچه سب بزرگوں سے فیض اُٹھا یا تھا، لیکن جیسا که دولت شاہ نے لکھا ہے، خرقۂ فقر مجدالدین بغدادی سے حاصل کیا تھا - مجدالدین بغدادی قطب الدین خوار زمشاہ کے طبیب خاص تھے"—

(شعرالعجم صفحه ۱۰)

شیخ مجدالدین بغدادی سے خرقۂ فقر حاصل کرنے کی روایت پر اگر ذرا غور کی جاے تو معلوم ہوجائیگا که وہ ایک نہایت کمزور اساس پر قائم ہے - تذکرۂ عطار میں اتفاقیه ایک فقرہ آجاتا ہے که :

" و من یکروز پیش امام مجدالدین خوارزمی در آمدم او را دیدم که می گریست-گفتم "خیر ست"-گفت "زهے سپاه سالاراں کہ دریں امت بودہ اند بمثابۂ انبیاء علیہم السلام کہ علماء امتی کا نبیاء بنی اسرائیل " پس گفت " ازاں میگریم کہ دوش گفتہ بودم کہ خداوندا کار تو بعلّت نیست ' مرا ازیں قوم یا از نظار گیاں ایں قوم گرداں کہ قسمے دیگر را طاقت ندارم ' می گریم کہ بود کہ مستجاب شدہ باشد "

(تذکرۃالاولیاء صفحہ ۶ طبع لیڈن)

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیایہ امام مجدالدین خوارزمی جوکہ عالم ہیں اور شیخ مجدالدین بغدادی' جو نجم الدین کبریٰ کے مرید ہیں ' ایک ہی شخص ہیں - دوسرے شیخ عطار جو کہا جاتاہے: سنہ ۵۱۳ ہجری میں ولادت پاتے ہیں' شیخ مجدالدین سے عمر میں بہت اقدم ہیں - شیخ مجدالدین کو جو شہرت حاصل ہوئی ہے وہ علاءالدین محمد خوارزمشاہ (سنہ ۵۹۶ ہجری و سنہ ۶۱۷ ہجری) کے عہد میں ہوئی ہے - اب کیا عطار اسی تراسی سال تک بے پیر رہے؟ بالخصوص ایسا شخص جو مشائخ کی صحبت کا بچپن ہی سے شیفتہ تھا - شیخ مجدالدین جو سنہ ۶۱۳ ہجری میں قتل کئے جاتے ہیں : اپنی وفات کے وقت غالباً جوان ہی تھے- اب شیخ عطار تصوف میں اس قدر شہرت اور تصنیفات کے باوجود آسّی (۸۰) سال کی عمر میں ایک جوان شخص کے' جوشہرت اور قابلیت میں کچھ بھی درجہ نہیں رکھتا ' مرید بنائے جاتے ہیں - شیخ مجدالدین کی شہرت اُن کےخون ناحق کی وجہ سے ہوئی ہے' حمداللہ مستوفی کہتاہے:-

"شیخ مجدالدین بغدادی در سنہ ثلث وعشروسدس مائۃ بعہد ناصرخلیفہ بہ تہمت آنکہ با مادر خوارزم شاہ معاشرت ورزیدہ' بحکم خوارزمشاہ شہید شد- بعد از تنلش خوارزم شاہ پشیماں شد' بخدمتِ شیخ نجم الدین کبریٰ رفت وگفت: چنیں خطائے از من صادر شد' دیت خون او چہ باشد- شیخ گفت: جان من و تو و اکثر اہل جہاں بجہت خون او

نشاید - چوں نا کردنی کردہ شد، تدارک نتواں کرد"—

حقیقت میں عطار کے مرشد* ہونے کے مستحق خواجہ ابوالفضل سعدالدین شافعی المذہب ہیں، جو وزارتِ خراساں سے دست بردار ہوکر طبقۂ صوفیہ میں شامل ہوتے ہیں اور تیس سال سے زیادہ عرصہ تک گوشۂ عزلت میں مقیم رہے ہیں۔ شیخ عطار نہایت پر جوش اور معتقدانہ الفاظ میں "خسرو نامہ" میں منقبت کے بعد اُن کا ذکر کرتے ہیں - میں چند ابیات یہاں نقل کرتا ہوں:-

خدا را آنکہ محبوب و حبیب است	ابوالفضل جہاں پیرِ لبیب است
دل دیں خواجہ سعدالدین کہ امروز	دل اوست آفتاب عالم افروز
خراساں را وزارت داشت با لش	ولے انداخت او تا برد آلش
چو ابراهیم ادهم ملک بگزاشت	کہ چوں بستی خلافت یک جو انگاشت
سر یک موے او عالم نداند	کہ داند قدر او ادهم نداند
بحق امروز قطب اولیا اوست	حریم خاص را خاص خدا اوست
گر اوتادند، گر ابدال امروز	از و دارند کشف حال امروز
چو بود او در شریعت شافعی دوست	طریقت را علی الحق شافعی اوست
شدہ سی سال تا وے بر سخنہا	بخلوت روے آوردہ است تنہا
خدایا قادری و می توانی	باوج ہمتِ خویشش رسانی
مرا در خرمن او خوشہ چیں دار	ز نور او دلم را راہ بیں دار
کہ تا ایں بندہ هم پے بر پئے شاں	بیابد بار بر درگاہ سلطاں

(خسرونامۂ عطار صفحۂ ۳۵ طبع ثمر هند لکھنؤ)

شیخ مجدالدین اور قطب الدین خوارزم شاہ معاصر نہیں ہیں - قطب الدین

---

* ہفت اقلیم میں، اس سلسلہ میں شیخ رکن الدین اکاف کا نام بھی دیا ہے اور مثنویات میں کئی موقعوں پر عطارنے اُن کی حکایات درج کی ہوں - لیکن شیخ مجدالدین کا نام کہیں نہیں آتا —

خوارزم شاہ (سنہ ۴۹۰ و سنہ ۵۲۱ هجري) خوارزم شاهیوں کا دوسرا سلطان هے اور جس پادشاہ کے حکم سے شیخ مجدالدین هلاک هوے ' وہ علاءالدین محمد خوارزم شاہ (سنہ ۵۹۶ هجری و سنہ ۵۱۷ هجری' هے—

قوله' "فقرا کا ایک تذکرہ لکھا هے ' جو تذکرۃالاولیا کے نام سے مشہور هے اور حال میں مسٹر برون نے اُس کو شایع کیا هے' عبدالوهاب قزوینی نے' جو مسٹر برون کے شاگرد هیں' ایک محققانہ دیباچہ لکھا هے"—

(شعرالعجم صفحہ ۱۱ و ۱۲)

عطار کا یہ تذکرہ جس کا مولانا ذکر فرماتے هیں' حقیقت میں پروفیسر نکلسن نے مرتب کر کے سنہ ۱۹۰۵ع میں شایع کیا هے' علامہ محمد بن عبدالوهاب قزوینی ' پروفیسر برون کے شاگرد نہیں هیں' بلکہ شریک محنت فاضل—

قوله' "صوفیانہ شاعری کے چار ارکان هیں ' سنائی' اوحدی' مولانا روم' اور خواجہ فریدالدین عطار"—

(شعرالعجم صفحہ ۱۲)

اِس فہرست میں اوحدی کے نام کا داخلہ غیر ضروري معلوم هوتا هے - اوحدالدین کرمانی صاحب تصنیف نہیں هیں - اگر مولانا شبلی کی مراد اوحدی مراغی سے هے تو اُن کے پایہ نے ' بلکہ اُن سے بہتر درجنوں صوفی شعرا کا نام لیا جا سکتا هے -

—— شیخ عطار کے حالات ——

تذکرہ نگاروں نے بہت کم حالات دیے هیں اور جو کچھ دیے هیں' شبہ سے خالی نہیں هیں' کیونکہ اُن کے نام پر اور لوگوں نے کتابیں تصنیف کر کے اُن کے حالات کے مرقع کو اور بھی تاریک بنا دیا هے - اُن کا نام محمد هے' فریدالدین لقب اور فرید اور عطار تخلص هے :—

من محمد نامم و این شیوہ نیز
ختم کردم چوں محمد ای عزیز (مصیبت نامہ قلمی)

وطن نیشا پور ہے کیونکہ ان کا معاصر محمد عوفی اِن کو نیشاپوري بیان کرتا ہے - خود عطار نے اپنے وطن کا ذکر نہیں کیا - جس شعر میں نیشا پور کا ذکر کیا ہے اُس سے اُن کی وطنی خصوصیت واضح نہیں ہوتی :—

بود مجنونے بہ نیشا پور در　　زو ندیدم در جہاں رنجور تر

تاریخ ولادت سنہ ۵۱۳ھ بتائی جاتی ہے، لیکن یہ قرین قیاس نہیں، کیونکہ ان کے ہاں ایسے بزرگ جو اُن کے قریب العہد ہیں، ایسے ہیں، جو سنجر متوفی سنہ ۵۵۲ھ کے زمانے سے تعلق رکھتے ہیں اور اُن سب کا ذکر شیخ عطار بصیغۂ ماضی بیان کرتے ہیں، مثلاً: سلطان سنجر، مہستی ندیمۂ سنجر، عباسہ، ایک با خدا خاتون، جن کا سلطان سنجر معتقد ہے، خواجہ رکن الدین اکاف اور احمد غزالی - سب سے حیرت خیز یہ امر ہے کہ عطار اپنی اصلی تصنیفات میں، اپنے کسی معاصر کا ذکر نہیں کرتے - البتہ مظہرالعجائب میں شیخ مجدالدین اور شیخ نجم الدین کبری کا ذکر آتا ہے، لیکن میں اس تصنیف کو شیخ عطار کی تسلیم نہیں کرتا - البتہ اِن کی شاعری کا زمانہ معلوم کرنے کے لیے ہمارے پاس دو ذرائع ہیں، پہلا یہ ہے کہ منطق الطیر کے بعض نسخوں میں اِس کی تاریخ تصنیف سنہ ۵۷۳ھ ملتی ہے چنانچہ:

روز سہ شنبہ بوقت استوا　　بیستم روزے بُد از ماہ خدا
پانصد و ہفتاد و سہ بگذشتہ سال　　ہم ز تاریخ رسول ذوالجلال

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عطار اس سن میں تصنیف و تالیف میں مشغول ہیں - دوسرا ذریعہ یہ ہے کہ خروج مغول کے متعلق اُن کے ہاں ایک دو حوالے ملتے ہیں - مثلاً:

ہر کو بخلاف پشت بر دیں آرد　　در وقت زکوٰۃ بر جبیں چیں آرد
مستوجبِ حد گردد و جبار جہاں　　بر حد زدنش ترک ز ما چیں آرد

(از دیوان قلمی)

(دیگر) کافر ز رہ خطا ببازی ماند — وز راہ حقیقی نہ مجازی ماند
یا آنکہ مرا زیش شہیدانہ نبود — یا خود ز خطا کافر غازی ماند

اُن کا خاندان نہایت مذہبی تھا اور اسی مذہبی ماحول میں اُن کی تربیت اور نشو و نما ہوئی ہے۔ شیخ کے والد کا بڑی عمر میں انتقال ہوتا ہے - اسرار نامہ میں اُن کی وفات کا ذکر آتا ہے :—

بپرسیدم در آندم از پدر من — کہ چونی؟ گفت چونم اے پسر من
ز حیرت پاے از سر می ندانم — دلم گم گشت دیگر می ندانم
نگردد ایں کہاں کار دیدہ — ببازوے چو من پیرے کشیدہ
چنیں عالم کہ دریا میزند جوش — ز خونم قطرۂ برناورد جوش
بدو گفتم کہ چیزے گوے آخر — کہ سرگرداں شدم چوں گوے آخر
جوابم داد کاے دانندہ فرزند! — بفضل حق بہر نامے ہنرمند
ز غفلت خود نمائیدم ہمہ عمر — چہ گویم ژاژ خائیدم ہمہ عمر
بآخر دم چنیں گفت آں نکوکار — کہ یارب مر محمد را نگہدار
پدر ایں گفت و مادر گفت آمیں — وزاں پس زو جدا شد جان شیریں
خدایا گفت ایں ہر دو گرامی — بفضلت مہر بر نہ بر تمامی
اگر چہ گردنم زیر گنا ہست — دعاے ایں دو پیرم حرز را ہست
بہ بیں یارب دو پیر ناتواں را — بدیشاں بخش جان ایں جوانرا

والدہ سے بیحد محبت کرتے تھے' جو زہد و اتقا میں لا ثانی تھیں - اُنھوں نے بھی دراز عمر پائی اور اٹھائیس برس تک بے چادر اور بے موزہ رہیں اور ترک دنیا کر کے' گوشۂ عزلت میں بیٹھکر' دن رات عبادت الٰہی میں مصروف رہیں - خسرو نامے میں اُن کے مرثیے میں فرماتے ہیں :

مرا گر بود اُنسے در زمانہ — بہادر بود او رفت ازمیانہ
اگرچہ رابعہ چندیں بفربود — ولیک ایں ثانیہ آں شیر نر بود

نبود اوزن که مرد معنوی بود — سحر گاهاں دعاے او قوی بود
زسال بست و هشت اکنوں زیادت — که نے چادر نه موزه بود عادت
ز دنیا فارغ و دولت گزیده — گرفته گوشهٔ و عزلت گزیده
چناں پشتم قوی داشت آں ضعیفه — که ملک شرع را روے حنیفه
اگرچه عنکبوتے ناتواں بود — ولیکن بر سر من پہلواں بود
نه چنداں ست بر جانم غم او — که بتواں کرد هرگز ماتم او
چو محرم نیست ایں غم باکه گویم؟ — مرا او بود محرم تاچه گویم
اگر برسم باو با او بگویم — غمے کز مرگ او آمد برویم

(خسرو نامه مطبع ثمر هند صفحه ۲۰۶)

خسرونامه اُنهوں نے ساٹھ سال کی عمر کے کئی سال بعد لکھا هے' اِس عمر میں بھی وه والده کو اِس طرح یاد کرتے هیں' جیسے کوئی بچه کر رها هو' لیکن یه سب اُسی مذهبی تعلیم کا نتیجه هے' جس کی فضا میں عطار نے پرورش پائی تھی-

عطار اِس قدر گمنام رهنا چاهتے هیں که باوجود تصنیفات کثیره' اپنے ذاتی حالات بہت کم دیے هیں - اسرار نامے میں اپنی زندگی کے بعض پہلووں کا ذکر کرتے هوے غزا میں شریک هونے کا اتفاقیه ذکر کردیا هے:—

بهر دکاں کسے پرّد پریدیم — بهر کم کاں کسے پوید دویدیم
گهے با رند در میخانه بودیم — گهے رخ بر در میخانه سودیم
گهے زنار ترسایاں به بستیم — گهے در دیر ترسایاں نشستیم
گهے با کافراں در جنگ بودیم — گهے با آتش اندر سنگ بودیم
گهے سجاده بر دوش آوریدیم — گهے در بحر دل جوش آوریدم
گهے سر بر سر زانو نهادیم — گهے در هاؤ هو اندر فتادیم

اُن کی طبیعت میں انتہائی مسکنت اور کسر نفسی جاگزیں تھی - ایک دن ایک دوست نے اُن سے بیان کیا که فلاں شخص بطریق حلال روزی

کھاتا ھے، یعنے یہودیوں سے جزیہ وصول کر کے اپنا پیٹ پالتا ھے اور اِس سے اچھی کمائی اور کیا ھوسکتی ھے - شیخ نے فرمایا کہ: میں اِس کے متعلق کچھہ نہیں جانتا، صرف اتنا جانتا ھوں کہ میں ننگ دو جہاں ھوں، اگر سو یہودی بھی مجھسے جزیہ لیں تو کم ھے'' :—

رفیقے گفت با من کاں فلانے حلا لے میخورد قوت جہا نے
کہ جزیہ از یہوداں می ستاند وز آں جا می خورد بہ زیں کہ داند؟
بدو گفتم کہ من آن می ندانم من آں دانم کہ از ننگ جہانم
کہ باید صد جہود بس پریشاں کہ تا خواھند از من جزیہ ایشاں

(کلیات عطار- الٰہی نامہ صفحہ ۸۷۸ نولکشور)

اُن کا پیشہ طب تھا اور ساتھہ ھی دارو خانہ کھول رکھا تھا اور مطب بڑی رونق پر تھا - ایک حکایت میں کہتے ھیں :- ''ھمارے شہر میں ایک مالدار بخیل بیمار تھا، جس کے پاس پچاس ہزار دینار نقد موجود تھے - مجھے اُس کے علاج کے لئے ایک آدمی لینے آیا - میںنے جاکر دیکھا کہ سو برس کا پیرفرتوت ھے، جو بوجہ مرض بالکل گُھل چکا ھے اور موت کے گھاٹ آلگا ھے - اِس کے پہلو میں ایک سر بھر عرق گلاب کا شیشہ رکھا ھوا تھا- میںنے تیمارداروں سے کہا کہ شیشہ کھول کر تھوڑا سا گلاب مریض پر چھڑک دو - مریض نے جو نیم غشی کی حالت میں تھا، فوراً آنکھہ کھول دی اور کہنے لگا : خبر دار! گلاب نچھڑکنا! میں اِس کے صرف کئے جانے کے مقابلے میں اپنا مرنا آسان سمجھتا ھوں - بوڑھا بخیل یہ الفاظ ختم کرنے بھی نہ پایا تھا کہ اُس کا دم نکل گیا'' - اِس حکایت کا ابتدائی شعر ھے :—

بشہر ما بخیلے گشت بیمار کہ نقدش بود پنجہ بدرہ دینار

(اسرار نامہ صفحہ ۱۷۷ طبع طھران سنہ ۱۲۹۸ ھ)

تصنیفات میں ساتھہ برس کی عمر سے لیکر نوّے سال تک کی طرف اشارے ملتے ھیں:-

(۱) سی سال بصد هزار تگ بدویدیم — تا از رهِ تو بدرگهِ تو برسیدیم
سی سال دگر گرد درت گردیدیم — چوبک زن بام و حس دربودیم
(کلیات - مختار نامه صفحه ۹۵۲)

(۲) اگر من پشت راسازم کمانے — چو سالم شصت شد نبود زمانے
مرادرشست افتاده است هفتاد — چنیں صیدے کرادردست افتاد
زشستِ آں کماں تیرے شودراست — زشصت من کمان کوز برخاست
ازاں شست و کماں قوت شودبیش — ازیں شصت و کماں دل می شود ریش
(اسرار نامہ قلمی)

(۳) تو غافلی وبهفتاد پشت تو چو کماں — تو خوش بخفتهٔ و عمرت چوتیر رفته زشست
(دیوان قلمی)

(۴) چوں بهفتاد بیفتادی واین نیست عجب — عجب اینست که ایں نفس توهردم بتراست
(دیوان ایضاً)

(۵) مرگ در آورد پیش وادئیِ صدساله راه — عمر توافگند شست درسر هفتاد واند
(دیوان ایضاً)

(۶) گرو صل منت بایدا ے پیر نودساله — هم خرقه بسوزانی، هم قبله بگردانی
(دیوان ایضاً)

تمام عمر گوشۂ قناعت میں بسر کردی اور آستانۂ ملوک سے کوئی سروکار نہیں رکھا: —

چه خواهم کرد طول و عرض دنیا — کبودئے سما و ارض دنیا
مرا ملکے که من دارم بسنداست — و گردر بایدم چیزے بسنداست
چو در ملک قناعت پادشاهم — توانم کرد دائم هرچه خواهم
(کلیات - الٰهی نامه صفحه ۹۳۳)

دوسرے موقعے پر فرماتے ہیں: —

شکر ایزد را که ادباری نیم | بستهٔ هر ناسزاواری نیم
من ز کس بودل چرا بندے نهم | نام هر دو نے خداوندے نهم
نے طعامے هیچ ظالم خوردہ ام | نے کتابے راتخلص کردہ ام

(منطق الطیر - کلیات - صفحه ۱۱۶۲ - نولکشور)

ایک اور مقام پر فرمایا ہے :—

نی ز همت میل ممدوحے مرا | نی ز ظلمت خلوت روحے مرا
نی هوائے لقمهٔ سلطاں مرا | نی قفائے سیلیِ درباں مرا

(منطق الطیر - (کلیات) صفحه ۱۱۶۳)

دربار داری کے سلسلے میں اس قدر کہا جاسکتا ہے کہ کسی پادشاہ کی خدمت میں عید کی مبارک باد کا ایک قصیدہ لکھہ کر لے گئے ہیں - اُس کا نام کہیں بیان نہیں کرتے ، لیکن وہ پادشاہ بھی اُنہیں کے مذہب کا معلوم ہوتا ہے - اُس نے تین ماہ برابر روزے رکھے ہیں اور شیخ مبارک باد میں قصیدہ لکھتے ہیں اور ردیف بھی روزہ لاتے ہیں - مدح نگاری چونکہ اُن کو راس نہیں ہے' اِس لئے اِس قصیدے میں ایسے ٹھر خام پیدا کئے ہیں کہ قصیدہ کا جو ہر شناس اِن کو دیکھکر دنگ رہ جاے گا - گریز کرتے ہوے فرماتے ہیں :—

خدایگاں فلک قدر آنکه هر رمضان | ز خوان او بکشاداست قرص خورروزہ
سه ماہ روزہ چو او داشت نورِ روزهٔ او | مدام در دو جہاں گشت نامور روزہ
ز بهر روزهٔ شه نه سپهر جشنے ساخت | که بوکه شه بکشاید بدیں قدر روزہ

دعا کے وقت کہا ہے :—

خدایگانا شعر لطیف را عطار | ردیف کرد بمدح تو سر بسر روزہ
منم که ختم سخن بر منست و زهره کراست | که صد سخن بکشاید بدیهه بر روزہ
همیشه تا شب و روز است عید روزی باد | هزار عیدت و عیدیت باد هر روزہ

(دیوان قلمی)

بلبل نامہ عطار کی تصنیف مانا جاتا ہے' جو بحر ہزج' مسدس' محذوف میں ہے - اُس کے خاتمے پر بحر منسرح میں مثنوی میں کچھ اشعار ملتے ہیں' جن میں شاعر اپنے فرزند ضیاءالدین یوسف کو کچھ پند دیتا نظر آتا ہے:—

اے شب امید مرا ماہ نو　　دیدۂ بختم بجمالت گرو
از پس سی روز بر آید ہلال　　روے نمودی تو پس از شصت سال
سال تو چار است بوقت شمار　　چار تو چل باد و چلت باد چار
نام تو شد یوسف مصر وفا　　باد لقب دولت دیں را ضیا
من کنم از خامۂ حکمت نگار　　بہر تو ایں مایۂ حکمت نگار
گرچہ ترا نیست کنوں فہم تند　　چوں بعد فہم رسی کار بند!

فرماتے ہیں: جب تک تمھارے مُنہ پر خط نہ نکل آے' گھر سے باہر قدم مت دھرنا:-

تا نشود برقع روے تو موے　　پا منہ از خانہ ببازار و کوے
سلسلہ بند قدم خویش باش　　حبس نشین حرم خویش باش
ہیچگہ از صحبت ہم خانگاں　　رخت مکش بر در بیگانگاں

تعلیم اور مکتب نشینی کے سلسلے میں' جو نصیحتیں کی ہیں' اُن کے ضمن میں کہا ہے کہ استاد کی مار کھانا اگرچہ سعادت ہے' لیکن تم کوشش کرو کہ اِس سعادت سے محروم رہو:—

سیلئے او گرچہ فضیلت دہ است　　گر تو بسیلی نرسانی بہ است

قرآن پاک بچپن ہی میں حفظ کر لینا' کیونکہ بچپنے میں جو چیز یاد ہو جاتی ہے انسان بڑا ہوکر نہیں بھولتا:—

حرف نوشتہ بدل طفل خورد　　کز لک نسیاں نتواند سترد

خط پاکیزہ لکھنے کی کوشش کرنا- شعر گوئی اگر چہ ایک قسم کا کمال ہے لیکن اِس میں عیب بھی ہیں گاہے ماہے لکھو تو کوئی مضائقہ نہیں' لیکن میری

طرح اِس کو اپنا پیشه نه بنا لینا:-

در چه فتد که گهے اندیشه اش کوش که چوں من نکنی پیشه اش

مختلف بلبل ناموں کے خاتمے میں اشعار بالا میری نظرسے گذرے هیں' تاهم مجکو یقین نهیں آتا که یه عطار کے قلم سے نکلے هوں —

مذهباً سنت جماعت هیں اور ظن غالب هے که حنفی هیں - قریب قریب اپنی هر تصنیف میں اصحاب اربعه کی مدح میں قلم اُٹھایا هے - قاضی نورالله شوستری اور میرزا محمد بن عبدالوهاب قزوینی اُن کو شیعه تسلیم کرتے هیں' لیکن همیں یاد رکھنا چاهیے که ان بزرگوں کا یه عقیده محض ایسی تالیفات پر مبنی هے جو بعد میں شیخ عطار کی طرف منسوب کر دی گئی هیں - ورنه عطار نے ایک سے زیاده موقعے پر اصحاب ثلاثه کے مخالفوں کو تشنیع کی هے - اُن کے نزدیک چاروں صحابه کا رُتبه برابر هے:—

دوئی باشد کجا در چار اے خام یکے بینی در آغاز و در انجام
گر ایں هر چار را باهم نداری تو یک عالم ز دو عالم نداري

(خسرو نامه'صفحه ۴۱ و ۴۲' طبع ثمر هند)

مصیبت نامه میں تعصب کرنے والوں کو خطاب کے فرماتے هیں:

اے تعصب بند بندت کرده بند چند گوئی چند از هفتاد و اند
ور سلامت هفت صد ملت ز تو لیک هفتاد و دو بر عات ز تو
هست کیش و راه ملت بے شمار تا تو نشماری نیابی روزگار
گر تو هستی پس رو صدیق را یا علی آں عالم تحقیق را
بے تعصب گرد و بے تقلید شو شرک سوز و غرقهٔ توحید شو
چوں صحابه یک بیک آزاده اند در هدایت چوں نجوم افتاده اند
گر کسے در یک تن آں قوم پاک کرد طعنے بر ستاره ریخت خاک

(مصیبت نامه' قلمی)

اور حضرت ابوبکر کے حق میں لکھتے ہیں:

از صحابہ سی ہزار و سہ ہزار از میان جانش کردند اختیار
او کجا در بند آب و جاہ بود کآب و جاہ او ہمہ اللہ بود
آں کہ از عرش و فلک فارغ بود شک نباشد کز فدک فارغ بود

(مصیبت نامہ، قلمی)

منطق الطیر میں پھر بھی استدلال پیش کیا گیا ہے :—

اے گرفتار تعصب آمدہ دائما در بغض و در حب آمدہ
گر تو لاف از عقل و ز لب میزنی پس چرا دم از تعصب میزنی
در خلافت میل نیست اے بے خبر میل کے آید ز بوبکر و عمر
میل اگر بودے در آں دو مقتدا ہر دو کردندے پسر را پیشوا
بہترین چوں نزد تو باشد بتر کی توان گفتن ترا صاحب نظر
کی روا داری کہ اصحاب رسول مرد ناحق را کنند از جاں قبول
یا نشانندش بجائے مصطفیٰ از صحابہ نیست ایں باطل روا
اختیار جملہ شاں گر نیست راست اختیار جمع قرآں پس خطاست
بلکہ ہر چہ اصحاب پیغمبر کنند حق کنند و لائق و درخور کنند
گر کنی معزول یک تن رازکار میکنی تکذیب سی و سہ ہزار

خلیفۂ ثانی حضرت عمر کے بارے میں کہتے ہیں :—

در عمر گر میل بودے ذرۂ کی پسر کشتے بزخم درۂ
گر خلافت بر خطا میداشت او ہفدہ من دلقے چرا میداشت او
چوں بخامہ دست دادش نے گلیم بر مرقع دوختہ پارہ ادیم
آنکہ زینساں شاہئے خیلے کند کی روا داری کہ او میلے کند
آنکہ گاہے خشت و گاہے گل کشد ایں ہمہ سختی نہ بر باطل کشد
گر خلافت بر ہوا میراندے خویشتن بر سلطنت بنشاندے

شہر ہاے منکراں ہنگام او — شد تہی از کفر در ایام او
گر تعصب میکنی از بہر آں — نیست انصافت بہیر از قہر آں

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے متعلق گویا ہیں :—

چند گوئی مرتضیٰ مظلوم بود — از خلافت راندن محروم بود
چو علی شیر حق است وتاج سر — ظلم نتواں کرد بر شیر اے پسر
مرتضیٰ نامے مکن از خرد قیاس — زاں کہ درحق غرق بود آں حق شناس
گر چو تو پُرکینہ بودے مرتضیٰ — جنگ جستے پیش خیلے مصطفیٰ
او ز تو مردانہ تر آمد بسے — پس چرا جنگے نکرد او با کسے
گر بنا حق بود صدیق اے عجب — او چو برحق بود حق کردے طلب
پیش حیدر خیل ام المؤمنین — چوں نہ بر منوال دیں جستند کین
لاجرم چوں دید چنداں جنگ وشور — دفع کرد آنقوم را حیدر بزور
آں کہ با دختر ترا نہ جنگ کرد — داند او سوے پدر آہنگ کرد
اے پسر تو بےنشانی از علی — عین و لام و یا بدانی از علی

حضرت عمر کے حق میں کہتے ہیں :—

اگر بودل ز فاروقت غبار یست — ترا در راہ دیں آشفتہ کاریست
چہ بر خیزی بخصمئی چراغے — کہ روشن زوست چوں فردوس باغے
عجم ز اول جہود و گبر بودند — از و گوے مسلمانی ربودند
کسے کا جدادش ایماں از عمریافت — ز مہر او چرا امروز سر تافت

(خسرو نامہ قلمی)

——(کلام پر تبصرہ)——

سادگی اور سلاست شیخ عطار کے کلام کا سب سے نمایاں وصف ہے - اُن کا اصلی مقصد شاعری نہیں ہے، بلکہ شعر کو اپنے خیالات و جذبات و واردات کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے- محاسن شاعری کا کہیں نام کو بھی سراغ نہیں-سیدھی سادی زبان

میں جو کچھہ کہنا ہوتا ہے، کہہ گذرتے ہیں۔ تصنع اور آورد کا سایہ تک نظر نہیں آتا۔ الفاظ کی تلاش یا اُن کے انتخاب کی ضرورت اُنھیں کبھی محسوس نہیں ہوتی۔ اور مضامین ہیں کہ بادل کی طرح اُمڈے چلے آتے ہیں۔ لکھنے سے نہ اُن کا قلم تھکتا ہے اور نہ دماغ خستگی محسوس کرتا۔ عطار پُرگوئی کے لیئے مشہور ہیں اور خود اِنھیں اِس کا اعتراف ہے، بلکہ شکایت ہے کہ میں ایک مضمون کی خواہش کرتا ہوں اور ایک کی بجاے دس آ جاتے ہیں:-

چنانم قوت طبع است در فکر — کہ یک معنی بخوانم صد دهد بکر
در اندیشه چناں مست و خرابم — کہ دیگر می نیاید هیچ خوابم
نیابم خواب شب بسیار و اندک — ازیں پهلو همی گردم بداں یک
همی رانم معانی را ز خاطر — کہ یکدم خواب یابم بوکه آخر
یکے را گر برانم ده بر آید — بتر را گر برانم به بر آید
ز بس معنی که دارم در ضمیرم — خدا داند که در گفتن اسیرم

(اسرار نامہ، صفحہ ۴-۱۹۵ طبع طہران)

پُر گوئی کے با وجود اعلیٰ درجہ کی پختگی موجود ہے۔ گھلاوٹ اور تاثیر غالب ہے۔ تمام کلام صاف اور ہموار ہے اور حشو و زوائد سے پاک ہے۔ خیالات متین اور سنجیدہ ہیں۔ جن میں خلوص اور پاک اعتقادی کی لہر شروع سے آخر تک دوڑ رہی ہے۔ اِنھیں اوصاف نے اُنھیں ایران کے مشاہیر اور اعلیٰ اساتذہ کی صف میں کھڑا کردیا ہے۔ خود اُن کے اپنے زمانے میں ایک بڑی جماعت اُن کی شیدائی اور معتقد تھی۔ اپنے ایک دوست کا ذکر کرتے ہیں، جس کی فرمایش پر اُنھوں نے خسرو نامہ تصنیف کیا ہے کہ اُس کو، اُن کا پورا مختار نامہ۔ سو قصیدے، ایک ہزار غزلیں اور قطعات یاد تھے۔ اس ایک بیان سے اُن ایام میں عطار کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے —

قدما کے مقابلے میں اُنھوں نے غزل کو بیحد ترقی دی ہے۔ جو غزل صاف نکل آتی ہے،

وہ سعدی کی غزل کے ہم پلہ ہے - غزل میں اُنھوں نے رندی اور مستی کے مضامین روشناس کر دیے ہیں - خمریات میں خیّام کا سارنگ ہے، لیکن اُس کے ہاں شراب محض ہے اور اِن کے ہاں شراب معرفت ہے، اِس میدان میں وہ صوفیا کے نبی غیر مرسل شمار ہونے چاہئیں - حقیقت کو مجاز کی زبان میں بیان کرنے کی بنیاد حکیم سنائی ڈالتے ہیں، لیکن یہ عطار ہیں، جو اِس بنیاد پر عالی‌شان عمارت تیار کرتے ہیں - می وجام، پیمانۂ و میخانہ، رند و خرابات، زنار و بت، ترسا و کنشت، جو فارسی غزل گویوں کے دستمایۂ ناز ہیں، اصل میں اِن کے مقبول بنانے والے فریدالدین عطار ہیں - غزل میں عشق کی چاشنی کا رنگ، عطار سے پیشتر موجود تھا - مگر جوش و سرمستی، محویت و استغراق، عطار سے قبل نا معلوم کیفیت تھی - سنائی تصوف کے کوچے میں آنے کے باوجود، نرے زاہد خشک ہی رہے، اُن کے ہاں شریعت پہلے ہے اور طریقت بعد میں، مثلاً فرماتے ہیں : -

ز راہ دیں تواں آمد بصحرائے نیاز آرے
بہ معنٰی کی رسد مردم گذر نا کردہ بر اسما

(دیگر) چو جاں از دیں قوی کردی تن از خدمت مزّین کُن
کہ اسپ غازی آں بہتر کہ با برگستواں بینی

(دیگر) دولت دیں نی و بر جاں نقش حکمت دوختن
نوح کشتی نی و درد دل عشق طوفاں داشتن

لیکن عطار زہدیت سے گذر کر، عشق و محویت کی منازل میں مقیم ہیں - چنانچہ : -

گر سِرِ عشق خواہی از کفر و دیں گذرکن
کانجا کہ عشق آمد، چہ جائے کفر و دین است

(دیگر) لب دریا ہمہ کفراست و دریا جملہ دینداری
و لیکن گوہر دریا ورائے این و آں باشد

(دیگر) ز کفر و دین و ز نیک و ز بد ز علم و عمل
بروں گذر کہ بروں زیں بسے مقامات است

اسی غزل کے باقی اشعار بھی ملاحظہ ہوں، خوصاً مطلع جو بالکل حافظ کے رنگ میں ہے: —

بیا کہ قبلۂ ما گوشۂ خرابات است
بیار بادہ کہ عاشق نہ مرد طاماتست
مگو ز خرقۂ و تسبیح زانکہ ایں دل مست
میاں بہ بستہ بزنار در خراباتست
چہ داند آنکہ نداند کہ چیست لذت عشق
ازانکہ لذت عاشق ورائے لذاتست
مقام عاشق و معشوق از دو کون بیرونست
کہ حلقۂ در عشّاق تا سمٰواتست
بنوش درد و فنا شو اگر بقا خواہی
کہ زاد راہِ فنا دردی خراباست
بکوے نفی فرو شو چنانکہ برنائی
کہ گرد دائرۂ نفی عین اثباتست
زہر دو کون فنا شو دریں رہ اے عطار
کہ فانیِ رہِ عشّاق فانی الذاتست

الغرض عشق و سرمستی اور فنائیت کا جذبہ غالب ہے۔یہ اشعار بھی پیش نظر رہیں: -

گُم شدم درخود نمیدانم کجا پیدا شدم
شبنمے بودم ز دریا غرقہ در دریا شدم
سایۂ بودم زاول بر زمیں افتادہ خوار
راست کاں خورشید پیدا گشت نا پیدا شدم

واردات عشق

ترسا بچه ام افگند از زهد برسوائی
اکنوں من و زنّارے در دیر به تنهائی
دے زاهد دیں بودم ، دریاے یقیں بودم
سجادہ نشیں بودم ، سردفتر دانائی
امروز اگر هستم دُردی‌کش و سرمستم
درتبکدہ بنشستم ، دیں دادہ به ترسائی
نه محـــرم ایمانم ، نه کفر همی دانم
نه اینم و نه آنم ، درماندہ برسوائی
دوش از غم کفرو دیں یعنی که نه آں وایں
بنشسته بُدم غمگیں شوریدہ و سودائی
نا گه ز دروں جاں در داد ندا جاناں
کاے عاشق سر گرداں تا چند ز شیدائی
روزے دو اگر ازما ماندی تو چنیں تنها
باز آے سوے دریا چوں گوهر دریائی
هر چند که بے دردی ، کے محرم ما گردی
فانی شو اگر مردی ، تا محرم ما آئی
عطار چه دانی تو ، ویں قصه چه خوانی تو
گر هیچ نهانی تو ایں جا شوی آں جائی

(دیگر) دے بامداد کاں صنمِ آفتاب روے
برمن گذشت همچو مه اندر میان کوے
گفتم : "مگر عظیمت خمـار کردہ"
گفتا : "بلے تو نیز بیا با کسے مگوے"

چوں ساعتے بر آمد من نیز در شدم
او در درون و خلق ز بیروں بگفت و گوے
دیدم بناز تکیه زده بر کنار حوض
همچوں گلے که نو بدمد بر کنار جوے
میکرد آب را تن و اندام او خجل
میزد شراب از لب او سنگ بر سبوے
گیسوے مشکبوے سپر در فگنده بود
موے میانش گم شده اندر میان موے
چوں دید کآب دیدۂ من گرم می رود
مشتے گلم بداد که دست از ذات بشوے
دست از دلم بشستم و آنگاه گفتمش
کاے جان نازنیں! دل (عطار) را بجوے

وحدت وجود - اُن سے پہلے فارسی نظم میں اِس کا بہت کم پتہ چلتا ھے (مستزاد) :—

نقد قدم از مخزن اسرار بر آمد — خود گنج عیاں شد
خود بود که خود بر سر بازار بر آمد — بر خود نگراں شد
در کسوت ابریشم و پشم آمد و پنبه — تا خلق بپوشند
خود بر صفت جبۂ و دستار بر آمد — لبس همگاں شد
در موسم نیساں ز سما شد سوے دریا — در کسوت قطره
در بحر بشکل در شهوار بر آمد — ر گوش بتاں شد
در عین بتاں خواست که خود را بپرستد — خود را بپرستید
خود گشت بت وخود بپرستار بر آمد — خود عین بتاں شد
خود بر سر خود تیغ جفا زد ز سر قهر — خود مرهم خود جست

خود بر صفت خستہ ببازار بر آمد — خود فاتحہ خواں شد
خود بزم شدو میخور وساغر شد و ساقی — خود پیر خرابات
خود مے شد و خود از خم خمّار بر آمد — خود کوزہ کشاں شد
اشعار مپندار اگرچشمِ سرت ہست — رازیست نہفتہ
آنچہ بزباں از دلِ (عطار) بر آمد — ایں بود کہ آں شد

قصائد اکثر برباد ہوگئے ہیں اب جو ملتے ہیں تیس چالیس سے زیادہ نہیں - اُن میں دنیا کی بےثباتی اور انسانی زندگی کی ناپائداری کے تمام دلائل لاکر ہمکو روحانیت کے طرف مدعو کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ فرماتے ہیں کہ ہم سب فانی ہیں اور دوران حیات میں عاجز وناتواں - افلاک و ایام کے آغوش میں بسنے والا انسان جو تقدیر کی زنجیروں میں سخت جکڑا ہوا ہے دنیا میں آکر پابند غفلت اور محوِ خواب بنگیا ہے حالاں کہ اُس کا بار گراں ہے ' اِس کی منزل دراز ہے اور موت اُس کی گھات میں ہے۔ کہتے ہیں انسان کا دیباچہ و تہمتِ حیات خون و خاک ہیں - وہ خون جو رحم مادر میں قرار پکڑتا ہے اور وہ خاک جو بعد حیات اُس کو اپنے آغوش میں جگہ دیتی ہے - انسان اگر دیدۂ غور سے زمین پر نگاہ ڈالے تو مشرق سے مغرب تک اُس کو نظر آئیگا کہ چپہ چپہ مقام پر اس کے ابنائے جنس محوِ خوابِ عدم ہیں :—

کز شرق تا بغرب سراپاے خفتہ اند — خورد وبزرگ وپیروجوان وشہ وگدا

(دیگر) زیر خاک از حدّ مشرق تا بمغرب خفتہ اند
بندہ و آزاد و شہری و غریب و شیخ و شاب

زمانہ ماہ نو کی داس (درانتی) بنا تا ہے اور اِس داس سے اُس بے بس گھاس یعنے اِنسان کو کاٹتا اور چھانٹتا رہتا ہے:—

چو داس ماہ نو از بہر آں ہمی آید
کہ تا چو خوشہ سرِ خلق می‌زند زقفا

گیا میدمد از خاک گور و غم اینست
کہ نیست هیچ غمے داس را ز رنج گیا

فردوسی یہی خیال ان الفاظ میں ادا کرتا ہے:—

بیاباں و آں مرد با تیز داس   گیاہ تر و خشک از و هر هراس
تر و خشک را او همی بد رود   و گر لابہ سازی همی نشنود
درو گر زمانست و ما چوں گیا   همانش نبیرہ همانش نیا

ایام حیات میں جو لوگ گلاب کی طرح شگفتہ تھے اب اُن کی خاک پر ابر گلاب برساتا ہے، سنبل کی طرح جن کی زلفیں تابدار تھیں خاک تاریک نے وہ سر نہیں چھوڑے اور نہ وہ زلفیں۔ اِس خاک پر اِتراتے نہ چلو کیوں کہ تمہارا راستہ حسینوں کی آنکھوں پر سے گزرتا ہے - لالہ میں جو یہ سرخی دیکھتے ہو یہ تمہارے عزیزوں هی کا خون ہے جو خاک پر بہایا گیا -اِس موقعہ پر عطار بالکل خیام کی بولی بولنے لگتے ہیں:—

و آں کہ رویش همچو گُل بشگفتہ بودے، ایں زماں
ابر میریزد بزاری بر سر خاکش گُلاب
و آں کہ زلفش همچو سنبل تاب در سرداشتے
خاک تاریکش نہ سر بگذاشت نے زلف و نہ تاب

(دیگر)
جملۂ زیر زمیں گر بتحقیقت نگری
شکنِ طرۂ مشکیں و لب چوں شکراست
چشم دل بازکن ار مردمی و نیک بداں
مردمِ چشمِ بتانست کہ ترا رهگزراست

(دیگر)
از غبار خاک رہ مفشاں سرو دست اے عزیز
ز آں کہ فرق عزیزاں بد کہ ایں جا شد غبار

خون دلہاے عزیزاں ست در گل ریختہ
آں ہمہ سرخی کہ می بینی بروے لالہ زار
جملۂ زیر زمیں در خاک بر ہم ریختست
زلفہاے تابدار و لعلہاے آبدار
(دیگر) فصیح در سخن آمد بہ پیش من آں خم
کہ بودہ ام تن مردے ز مردمان کبار
ہزار بار خم و کوزہ کردہ اند مرا
ہنوز تلخ مزاجم ز مرگِ شیریں کار

(دیوان قلمی)

خیام کا یہ انداز عطار کو بیحد پسند ہے - غزلیات میں بھی بعض وقت یہی رنگ اختیار کیا ہے مثلاً :—

یک شربت آب خوش نتواں خورد در جہاں
کیں کوزہا زخاکِ تنِ دوستانِ ماست

(بیاض بندہ علی خاں)

قصہ مختصر' اِس قسم کا استدلال ہے جو عطار ہمکو دنیا سے دلگیر اور اُداس بنانے کے لئے پیش کرتے ہیں - یہ خیالات اگرچہ جدید نہیں کیوں کہ اُن کو قریب ہر ایرانی شاعر کے ہاں دیکھا جاتا ہے لیکن اُن کے ہاں یہ خیالات محض اتفاقیہ ہیں اور کوئی مقصد و غایت نہیں رکھتے مگر عطار کے ہاں وہ اُن کے فلسفۂ تصوف کے مبادیات میں داخل ہیں - وہ اُن کو دنیا کی طرف سے برداشتہ خاطر کر کے حقیقت کی دعوت دیتے ہیں- فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے دل کی صفائی اور طہارت حاصل کرنیکی کوشش کرنی چاہئے؛ یہ بات اشکِ گرم و آہِ سرد کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی' یعنے شب زندہ داری اور نالہ و زاری سے کام لو —

با دهانِ خشک و چشمِ تر قناعت کن از انک
هر که قانع شد بخشک و تر شهِ بحر وبراست

(دیگر) زاشک‌گرم و دم سردِ خود بکن خوے خشک
که معتدل تر ازیں نیست هیچ آب و هوا

عطار نے انسانی زندگی کی بے اعتباری اور بےحقیقتی پر نادر مضامین نکالے هیں، فرماتے هیں :—

قطرۂ بیش نۂ چند ز خود اندیشی قطرۂ چیست اگر گم شد ا گردریاشد
بود نا بودِ تو یک قطرۂ آبست‌همی که ز دریا بکنار آمد و در دریاشد

(بیاض بندہ علی خاں)

خسرو نامہ میں کہتے هیں :—

در آمد پشۂ از لاف سر مست دمے بر فرقِ کوہِ قاف بنشست
چو بر جست و ازآنجا باعدم‌شد چہ افزود اندراں کوہ و چہ گم شد

فردوسی کے هاں یہ خیال بہتر پیرایہ میں ادا هوا هے:—

یکےمرغ برکوہ بنشست و خاست برآں کُہ‌چہ‌افزود ازاں کُہ چہ کاست
تو آں‌مرغی‌وایں جہاں کوہ‌تست چو رفتی جہاں را چہ اندوہ تست

(بیاض بندہ علی خاں)

مختار نامہ میں یہی مطلب یوں ادا هوا هے : —

خلقے کہ دریں جہاں پدید ا ر شدند در خاک بعاقبت گر فتا ر شدند
چندیں‌غم خودمخورکہ‌همچوں من‌وتو بسیار در آمد ند و بسیار شدند

(کلیات عطار صفحہ ۹۹۵ طبع نولکشور)

قصائد اگرچہ اکثر زهد و حکمت و پند و موعظت کے مضامین پر شامل هیں لیکن ذیل کے اشعار میں کسیقدر رنگ بدلا هے اور نظارۂ گل و ریاحین میں مصروف هیں: -

بادِ شمال می وزد جلوۂ یاسمن نگر — وقتِ سحر ز عشقِ گل بلبلِ نعرہ زن نگر
سبزۂ تازہ روے را نوخطِ جوئیبار بیں — سنبلِ شاخ شاخ را مورچۂ چمن نگر
سوسنِ نیے لطیف را همچو عروسِ بکر بیں — بادِ مشاط فعل را جلوہ گرِ سمن نگر
خیریِ سر فگندہ را در غمِ عمرِ رفتہ بیں — سوسنِ شیر خوار را آمدہ در سخن نگر
لعبتِ شاخِ ارغواں طفلِ زباں کشادہ بیں — نارکِ چرخِ بوستاں غنچۂ بیدھن نگر
تاکہ بنفشہ باغ را صوفیئے فوطہ پوش کرد — از پئے رهزنی او طرۂ یاسمن نگر
خیز و بیا بوقتِ گل بادہ بدہ کہ عمر شد — چند غم جهاں خوری شادیِ انجمن نگر
تا گلِ پادشاہ وش تخت نہاد در چمن — لشکریانِ باغ را خیمۂ نسترن نگر

باد شمال اور لشکریان باغ سے یکایک منہ موڑ کر پھر وهی قدیمی سرود فنا چھیڑ دیا ھے :-

اے دلِ خستہ عمر شد تجربہ گیر از جهاں — زندگیئے بدست کن مردنِ مرد و زن نگر
از سرِ خاکِ دوستاں مرج دریغ می زند — بر گذر و ز خاک شاں حسرت تن بہ تن نگر
فکر کن و بچشم دل حال گذشتگاں بہ بیں — ریختہ زیر خاکہا طرۂ پر شکن نگر
از سرِ خاکِ دوستاں سبزہ دمیدہ خوں گری — ماتم خویشتن بگیر مردنِ خویشتن نگر

غزلیات و قصائد کے مقابلے میں ان کی رباعیات کا درجہ بلند ھے، تمام مختار نامہ سر تا سر رباعی ھے، جس میں پانچ هزار باعیاں هیں - اصل میں چھہ هزار تھیں لیکن ایک هزار خود مصنف نے کم زور سمجھہ کر نکال دیں - ان کے علاوہ چارسو کے قریب اور رباعیاں دیوان میں شامل هیں - مختار نامہ کلیات کے ساتھہ نولکشور کے هاں چھپ گیا ھے --

کامل بننے کی تقلین دیتے هوے یہ کهتے هیں :-

گر خاص نۂ تو عام می باید بود — ور پختہ نۂ تو خام می باید بود
در کفر نۂ تمام و در ایماں هم — در هر چہ دری تمام می باید بود

یهی خیال مثنوی میں یوں ادا هوا ھے، کہ ایک ترسا زادہ مسلمان هوگیا

دوسرے دن اس نے شراب پی لی اور مست ہوگیا - اس کی ماں نے ملامت کی اور کہا کہ اے فرزند تونے اپنے فعل سے حضرت عیسیٰ کو ناخوش کردیا ہے اور حضرت محمد کو خوش نہیں کرسکا۔

یکے ترسا مسلماں گشت بیروز
به می خوردن شد آں جاهل دگر روز
چو مادر مست دید اورا ز دردی
بدو گفت اے پسر آخر چه کردی
که شد آزرده عیسیٰ زود از تو
محمد ناشده خوشنود از تو
مخنث وار ره رفتن نکو نیست
که هر رعنا مزاجے مردِ او نیست
بمردی رو دریں دنیا که هستی
که نامردیست در دیں بت پرستی

ترغیب عمل :- رباعی

بے ره رفتن رموز می اندیشی
بر نیست که در تموز می اندیشی
مردانِ جہاں هزار عالم رفتند
تو هر دو قدم هنوز می اندیشی

(دیگر)
تو بیکاری و همچنیں خواهی بود
اما همه ذراتِ جہاں در کارند

حکیم خیام کی تقلید :- رباعی

لاله ز رخ چو ماه می بینم من
سبزه ز خطِ سیاه می بینم من
و آں کاسهٔ سر که بود پر بادِ غرور
پیمانهٔ خاکِ راه می بینم من

(دیگر)
هر کوزه که بیخود بدهاں باز نهم
گوید بشنو تا خبرے باز دهم
من همچو تو بوده ام دریں ره صد بار
نے نیست همی گردم و نے باز رهم

(دیگر) هر ذره که در وادی و در کهساریست
از پیکر بر گزشتهٔ آثاریست
و آں هر صورت که بر درے و بر دیواریست
از روۓ خرد ز صورتِ دلداریست

(کلیات صفحه ۹۹۵)

(دیگر) قومے که بخوابِ مرگ سرباز نهند
تا حشر ز قال و قیلِ خود باز رهند
تا کے گوئی که کس خبر باز نداد
چوں بے خبرند ازچه خبر با ز دهند

(دیگر) بس عمرِ عزیز اے دلِ مسکیں که گزشت
بس کافرِ کفر و مومنِ دیں که گذشت
اے مردِ خرد حساب کن تا چند ند
چندیں که در آمدند و چندیں که گذشت

(دیگر) بر بستر خاک خفتگاں می بینم
در زیر زمیں نهفتگاں می بینم
چندانکه بصحراے عدم می نگرم
نا آمدگان و رفتگاں می بینم

جس چیز نے اُن کی شهرت کو بالِ پرواز دئے هیں وه اُن کی مثنویاں هیں - اُن میں اخلاق اور تصوف کو ملاکر لکھا هے - ان کی بڑی خصوصیت یه هے که حکایات کے بڑے شایق هیں، تمام مثنویوں میں قدم قدم پر حکایات موجود هیں - چوں که غیر معمولی حافظه کے مالک هیں اس لئے اخبار و قصص انبیا و اولیا و سلاطین و مشاهیر کثرت کے ساتهه مستحضر هیں اور جو نکته یا مسئله بیان کرنا چاهتے هیں اس کے مناسب حال اس ذخیرے سے

حکایت لے آتے ھیں اور لطف یہ ھے کہ ایک حکایت پر بس نہیں کرتے بلکہ اس موقع کے مناسب متعدد قصے اور چٹکلے بیان کرجاتے ھیں - قصہ گوئی کا لپکا اس قدر بڑھا ھوا ھے کہ حمد و مناجات جیسی مقدس زمینوں میں بھی قصہ نقل کرنے سے باز نہیں آتے - یہ سب کچھہ سہی تاھم ھر شعر صدق و اخلاص اور تاثیر کے رنگ میں ڈوبا ھوا ھے - حمد و منقبت و مناجات ایسی دھوم دھام سے لکھتے ھیں کہ فارسی گویوں میں کوئی بھی ان کی ٹکر کا نہیں - اور رسول کے تو عاشق زار ھیں - روضۂ رسول کی یاد میں لکھتے ھیں -

منم در فرقت آں روضۂ پاک — کہ بر سر می کنم از آرزو خاک
اگر روزے درآں میداں درآیم — چگوئی زیں خم چوگاں بر آیم
بآ ھے بگسلم بند جہا نرا — حنوطے سازم از خاک تو جانرا

(اسرار نامہ صفحہ ۲۷)

مختصر یہ کہ پاکی ، پاک اعتقادی اور پاک گوئی ان کا اصلی جوھر ھے اور یہی وصف ان کے کلام میں نمودار ھے —

مثنویوں کی زبان بہت صاف اور سلجھی ھوئی ھے - عطار جس تیزی سے نظم لکھتے ھیں اکثر لوگ اس تیزی کے ساتھہ نثر نہیں لکھہ سکتے - اگر فکر و تلاش سے قلم کو روک کر لکھتے تو بڑوں بڑوں سے بازی لیجاتے - صرف خسرو نامہ میں ذرا قلم کو روکا ھے اور نظامی سے ڈانڈا مینڈا ملا دیا ھے —

منطق الطیر میں منازل یعنے طلب ، عشق ، معرفت ، استغنا ، توحید ، حیرت ، فقروفنا ، بیان کی ھیں - اس کے لئے پرندوں کا ایک فرضی قصہ لکھا ھے کہ ایک روز پرندے جمع ھو کر یہ فیصلہ کرتے ھیں کہ دنیا میں ھر قوم کا کوئی نہ کوئی پادشاہ ھوتا ھے اس لئے ھمیں بھی کسی کو اپنا پادشاہ بنا لینا چاھئے - اس مقصد کے لئے قرعۂ انتخاب عنقا کے نام پر پڑتا ھے - اب سارے طیور ھد ھد کی رھنمائی میں عنقا کی تلاش میں نکلتے ھیں اور اس سفر میں مذکورۂ بالا

منازل سلوک ان کو پیش آتی هیں - عطار کی مثنویوں میں منطق الطیر سب سے زیادہ مقبول ھے اور متعدد بار چھپ چکی ھے —

الہی نامہ کے دوران میں یہ قصہ بیان ھوا ھے کہ کسی خلیفہ کے چھہ فرزند تھے - ایک روز خلیفہ نے بلاکر ان سے کہا کہ تم ھر ایک اپنی اپنی دلی آرزو بیان کرو تاکہ میں اسے بر لاؤں - چنانچہ پہلے نے عرض کی کہ پریوں کے پادشاہ کی لڑکی سے میری شادی ھو جاے - دوسرے نے کہا میں جادوگری سیکھنا چاھتا ھوں ' کیونکہ اس فن کا جاننے والا بڑا طاقتور ھو سکتا ھے - میں چاھتا ھوں کہ جادو کے زور سے کبھی پرندہ بن جایا کروں اور کبھی ھاتھی - تیسرے فرزند نے یہ استدعا کی کہ مجکو جام جہاں نما مل جاے جس کے ذریعہ سے میں دنیا کے تمام راز معلوم کر سکوں - چوتھے کی یہ خواھش تھی کہ مجکو آب حیات مل جاے - پانچواں حضرت سلیمان کی انگشتری کا خواستگار تھا اور چھٹا کیمیا کا طالب تھا - خلیفہ ان کی ھر خواھش کو ھوا و ھوس پر مبنی کہکر مسترد کر دیتا ھے اور مختلف حکایات سے ان کے نقائص پر استدلال کرتا ھے - یہ مثنوی بائیس مقالوں میں ھے اور کلیات عطار کیسا تھہ نولکشور کے مطبع میں چھپی ھے —

اسرار نامہ میں مختلف مقالوں میں جن کی تعداد بیان نہیں ھوئی سالک کے لئے عام اخلاقی پندو نصائح ھیں جو مختلف حکایات پر شامل ھیں - حمدونعت و منقبت اصحاب اربعہ کے اشعار جو اس مثنوی کے دیباچے میں پاے جاتے ھیں درحقیقت خسرو نامہ کی پہلی اشاعت سے تعلق رکھتے ھیں - جب اسرار نامہ تصنیف ھوا یہی اشعار اس کے ساتھہ بھی لگادئے گئے ' ما بعد میں ایک دوست کی فرمایش پر جب خسرو نامہ کا اختصار کیا تو حمدونعت وغیرہ کے جدید اشعار کہکر اس میں اضافہ کردئے - اسرار نامہ طہران میں سنہ ۱۲۹۸ ھ میں چھپ چکا ھے - مطبع والوں نے یہ ستم ظریفی کی ھے کہ منقبت اصحاب ثلاثہ کے تمام اشعار خارج کردئے ھیں —

مصیبت نامہ آج تک نہیں چھپا - میں جس نسخہ سے کام لے رہا ہوں وہ میرے عزیز دوست پروفیسر سراج الدین - ام اے ' ایم - او - ایل کے مطلوکہ کلیات عطار میں شامل ہے - عطار کے جس قدر کلیات معلوم ہیں ان میں یہ نسخہ اکثر سے قدیم ہے اس کی تاریخ کتابت سنہ ۸۵۷ ھ ہے —

مصیبت نامہ میں چالیس مقامات ہیں جن میں ' سالک فکرت ' تمثیلاً چاروں فرشتگان عظام ' عرش ' کرسی ' لوح محفوظ ' قلم ' بہشت و دوزخ ' آسمان ' آفتاب و ماهتاب ' اربع عناصر ' کوہ و دریا ' جماد ' نبات ' حیوان ' و حوش و طیور ' شیطان ' جن ' انسان ' ساتوں انبیاء کرام ' حس و خیال ' عقل ' دل اور روح کے پاس جاکر ہر ایک سے فرداً فرداً تلاش حقیقت اور رہبری کا سوال کرتا ہے - سب کے سب عجز کے قائل ہوتے ہیں اور روح آخر کار اس کا بیڑا پار کرتی ہے - ضمن میں بیسیوں حکایات نقل کردی ہیں - خاتمہ میں اشتر نامہ کی طرف شعر ذیل میں اشارہ ملتا ہے —

بختئی افلاک نتواند کشید　　نظم اشتر نامۂ تو اے فرید

یہ شعر بلکہ اس کے ساتھ جو قطعہ * ہے اگر الحاقی ہو تو کوئی تعجب نہیں کیونکہ اس شعر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اشتر نامہ مصیبت نامہ سے پیشتر

---

* وہ قطعہ حسب ذیل ہے

شاد باش اے شاہ دیوان سخن	در دریاے سخن کان سخن
داد دادی در سلوک و سیر راہ	لاجرم در ملک نطقی بادشاہ
نامۂ اسرار معنے چوں توئی	آسمان شعر را شعری توئی
شعر نتواں گفت سحراست ایں حلال	باد راز منطقت عین الکمال
نور جانہا در سواد خامہ است	سوز دلہا در مصیبت نامہ است
بختئی افلاک نتواند کشید	نظم اشتر نامۂ تو اے فرید
خسرو ملک سخن عطار شد	ز آنکہ خوشبو چوں گل و گلذار شد
روح پاکش غرق رحمت باد و نور	ہم نشین و ہمدمش رضوان و حور

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عطار کے کسی مداح نے یہ قطعہ لکھا ہے اور کاتب نے لکھتے وقت اس کو شامل متن کرلیا —

نظم ہو چکا ہے - خسرو نامہ پر نظر ثانی کے وقت عطار نے دیباچے میں اپنی مثنویوں کا ذکر کیا ہے، چنانچہ —

مصیبت نامہ زاد رهروانست — الهی نامه گنج خسرو انست
جهان معرفت اسرار نامه است — بهشت اهل دل مختار نامه است
مقامات طیور اما چنانست — که مرغ عشق را معراج جانست
چوخسرونامه‌راطرزےعجیب‌است — ز طرز او که ومه را نصیب است

(خسرو نامہ صفحہ ۵۲ - ۵۳ - ثمرہند) لکھنؤ سنہ ۱۲۹۵ ھ)

اِس فہرست میں سب سے اول مصیبت نامہ کا نام ملتا ہے، لیکن اشتر نامہ جو شعر بالا کی رو سے مصیبت نامہ سے اقدم ہے، شامل نہیں - جہاں مصنف نے اپنی اِس قدر منظومات گنائی ہیں، اشتر نامہ کو کیسے فراموش کر جاتے اگر وہ اُس وقت تک لکھا جا چکا تھا -

خسرونامہ عطار کی شاعری کی بہترین مثال ہے - وہ ایسے وقت کی یاد گار ہے جب کہ اُن کی شاعری جوان تھی اِس کتاب کی دو اشاعتیں ہیں - پہلی اشاعت چوں کہ طویل تھی اس لئے ایک دوست کے کہنے پر اِس کو مختصر کردیا - اختصار کے علاوہ اکثر موقوں پر مناسب اصلاح و ترمیم بھی کردی ہے اور حمد و نعت و منقبت کے جدید اشعار لکھکر شامل کردئے چنانچہ:—

چوں او در حقّ ایں قصه نکو گفت — چناں کردم همی القصه کو گفت
بروں کردم از آں جا انتخابے — بر آوردم ز یک یک فصل بابے
جدا نعتے و تو حیدے بگفتم — بسے از درّ حکمت نیز سفتم
و گر چیزے طر از ش رازیاں داشت — بگر دانیدم از طرزے که آنداشت

(خسرو نامہ صفحہ ۵۱ و ۵۲، طبع ثمرہند لکھنؤ

اِس مثنوی میں قیصر روم کے فرزند شہزادہ خسرو اور خوزستان کی شہزادی گُل رخ کے عشق کا قصہ ہے - خسرو عین ولادت کے وقت اِس کی

سو تیلی والدہ کے خوف سے ماں کے آغوش سے جدا کیا جاکر ایک وفادار کنیز کے ساتھہ رخصت کردیا جاتا ھے - یہ دایہ خوزستان پہنچ کر فوت ھوجاتی ھے اور ایک باغبان اُس کی پرورش اپنے ذمہ لے لیتا ھے - خسرو بہت جلد والئے خوزستان کے فرزند بہرام کا جلیس اور ھم مکتب ھو جاتا ھے - بہرام کی بہن گُل رخ خسرو پر عاشق ھوجاتی ھے - اِس کے بعد گُل رخ کی شادی والئے اصفہان کے ساتھہ ھوجاتی ھے - خسرو اصفہان پہونچکر گُل رخ کو لیکر فرار ھوجاتا ھے - اور روم چلا جاتا ھے - والئے اصفہان حسنا کو گُل رخ کے واپس لانے کے لئے تعین کرتا ھے - حسنا موقعہ پا کر گُل رخ کو چرا کر ایک صندوق میں قید کر دیتی ھے اور صندوق لیکر اصفہان کے اِرادے سے روانہ ھوتی ھے - راستے میں دریا میں طوفان آتا ھے اور کشتی ڈوب جاتی ھے - صندوق ایک چین کا ماھی گیر دریا سے نکال لیتا ھے - گُل رخ اِس طرح بچکر اور کئی مصیبتیں جھیلنے کے بعد شاہ چین کے محل میں پہونچ جاتی ھے اور کافور کی معرفت خسرو کو اپنی موجودگی کی اطلاع دیتی ھے - خسرو اُس کو لینے کے لئے آجاتا ھے اور انکی ملاقات ھوجاتی ھے - اِس قصے کے ضمن میں مصنف نے بزم و رزم، دریا، پہاڑ اور جزیروں کے منظر خوب بیان کئے ھیں - شیخ عطار جو اور تصانیف کے دوران میں محض ایک صوفئے با صفا اور زاھد خشک کے لباس میں نظر آتے ھیں، اِس مثنوی میں اپنی طبیعت کی رنگینی اور تخیل کی بلندی کا ایک اعلیٰ نمونہ دنیا کے سامنے پیش کر رھے ھیں - انہوں نے اپنی شاعری کا معیار اِس نظم میں اِس قدر بلندکردیا ھے کہ ھم اُس تصنیف کو بغیر کسی پس و پیش نظامی کی شیرین و خسرو کے پہلو میں جگہ دیسکتے ھیں اور اِس میں کوئی شک نہیں کہ ساتویں صدی ھجری تک جسقدر عشقیہ مثنویاں فارسی زبان میں لکھی گئی ھیں اِن میں خسرو نامہ کو دوسرے نمبر پر جگہ ملنی چاھئے - خسرونامہ مطبع ثمر ھند لکھنؤ میں (سنہ ۱۲۹۵) چھپا ھے، مطبع والوں نے ایسے اشعار نکال دئے ھیں جو منقبت اصحاب ثلاثہ،

امام بو حنیفہ و امام شافعی سے تعلق رکھتے ہیں اور جن کی تعداد اَسّی کے قریب ہے —

مثنویات عطار کی تاریخی حیثیت کے متعلق بھی یہاں چند الفاظ کہنے ضروری معلوم ہوتے ہیں - عطار بالعموم اپنی حکایات ایسے مآخذ سے لیتے ہیں جو تاریخی اشخاص اور اُن کی سر گزشت سے علاقہ رکھتے ہیں - اسلئے ان مثنویات سے تاریخی دلچسپی کا جدید مواد مل جاتا ہے - مثلاً سلطان محمود غزنوی کے متعلق شیخ عطار نے متعدد قصے* ایسے دئے ہیں جن کے رو سے سلطان کی سیرت و اخلاق کے اس پہلو پر روشنی ڈالی جا سکتی ہے جس کو اس کے مورخین نے بالکل فراموش کردیا ہے - مورخین اُس کی جنگ آزمائی، فتحیابی، دینی جوش و غزا کے خط و خال کو بڑے جوش و خروش سے بیان کرتے ہیں، لیکن اِس کے ذاتی حالات، جذبات و خیالات، عادات اور خوبو پر کوئی روشنی نہیں ڈالتے - شیخ اس معاملے میں ایک حد تک ہماری امداد کرتے ہیں - اُن کے بیانات میں محمود خدا ترس، درویش دوست، دلسوز، جفا کشی کا عادی، فیاض اور زندہ دلی کا شائق انسان ہے جو جلال و طنطنۂ سلطنت کو فراموش کرکے پرائیویٹ زندگی میں عام انسانوں سے سطح مساوات پر ملتا ہے - اُن کی تکلیف اور مصیبت کا اُس کے دل میں درد ہے اور امداد کرنے میں دریغ نہیں کرتا - فیاض اِس قدر کہ ادنیٰ ادنیٰ لطیفوں اور چٹکلوں پر دیناروں کی تھیلیاں برساتا ہے - اُس کے کان نصیحت سننے کے لئے ہر وقت آمادہ ہیں - ادنیٰ ادنیٰ اِنسان اُس بڑے آدمی کو کڑوی کڑوی باتیں سنا سکتا ہے - بہرام گور کی طرح شکار کا بیحد شائق ہے - صحراؤں میں شکار

---

* راقم نے اس سلسلہ میں ایک علحدہ مضمون لکھا ہے دیکھو اورینٹل کالج میگزین بابتہ ماہ فروری سنہ ۱۹۲۵ ع —

کے پیچھے گھوڑا ڈال دیتا ہے اور لشکر سے جدا ہو کر کہیں کا کہیں نکل جاتا ہے۔ دیہاتیوں اور صحرائیوں کا ناخواندہ مہمان بنتا ہے۔ کبھی کسی بوڑھے خار کش کی امداد کے لئے جو سنسان بیابان میں گدھے پر کانٹے لادنے کے لئے دوسرے انسان کی مدد کا منتظر ہے، بڑھتا ہے، کانٹوں میں ہاتھ ڈالتا ہے اور گدھے پر رکھوا دیتا ہے۔ کبھی کسی ضعیف عورت کی وزنی گانٹھ جو سر پر لئے جارہی ہے اور تھک گئی ہے، لیکر اپنے گھوڑے پر رکھ لیتا ہے، پھر بڑھیا کے چھیڑنے کے لئے گھوڑے کو چھوڑ دیتا ہے۔ بڑھیا پیچھے رہجاتی ہے، غل مچاتی ہے اور سلطان کو روز قیامت اور پل صراط کی یاد دلاتی ہے۔ محمود یہ ڈرنے والے الفاظ سنکر سہم جاتا ہے۔ کبھی کسی ماھگیر کے لڑکے کے ساتھ نصف کا شریک بن کر مچھلی کا شکار کھیلتا ہے اور دوسرے دن لڑکے کو بلوا کر اپنے برابر بٹھا لیتا ہے۔ کبھی کسی بوڑھے ہیزم فروش سے جاکر خود ہیزم خریدتا ہے، بوڑھا لکڑیوں کی قیمت "دو جو سیم" بتاتا ہے۔ محمود سونے کے سکوں کی تھیلی سے ایک ایک سکہ نکال نکال کر بوڑھے کے ہاتھ پر رکھتا جاتا ہے اور پوچھتا جاتا ہے کہ ان میں سے کونسا سکہ "دو جو سیم" کے برابر ہے۔ بوڑھا سر ہلاتا جاتا ہے اور ہر سکہ کو بڑا بتاتا ہے۔ آخر سلطان تھیلی پھینک کر کھڑا ہوجاتا ہے اور کہتا ہے کہ اچھا یہ تھیلی لیجاؤ اور اپنے دو جو سیم لیکر باقی کل واپس کر دینا۔ شیخ ابوالحسن خرقانی سے ملنے جاتا ہے اور ان کے ساتھ بھی شوخیوں سے باز نہیں آتا۔ ان حکایات پر نظر ڈالنے سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ محمود کی شمشیر نہیں تھی جس کے کار ناموں نے اسے محبوب بنا دیا تھا بلکہ اس کے یہی خسروانہ افعال تھے جنھوں نے وفات کے بعد بھی اس کی یاد کو تازہ اور اس کے نام کو محترم بنا دیا تھا—

محمود اور ایاز کے قصے جو سلجوقی عہد کے بعد فارسی ادبیات میں عالمگیر شہرت حاصل کرلیتے ہیں ان میں سے اکثر کے راوی شیخ عطار ہیں۔ خود مولانائے

روم نے ایک سے زائد حکایت عطار سے لی ھے بلکہ ایک موقعہ پر تو حوالہ بھی دیدیا ھے—

شعرا کے متعلق بھی عطار بعض جدید اطلاع بہم پہونچاتے ھیں - فردوسی کے سلسلے میں ان کے ھاں دو بیان ھیں - پہلا یہ کہ سلطان نے شاھنامہ کے صلے میں پیلبار انعام بخشا لیکن شاعر نے بلند حوصلگی کی بنا پر قبول نہیں کیا :-

اگر محمود اخبار عجم را — بداد آں فیل و لشکر و آں درم را

اگر تو شعر آری فیل وارے — نہ یابی یک درم در روزگارے

چہ آں گر فیل وارش کم نہ ارزید — بر شاعر فقاعے هم نہ ارزید

زھے ھمت کہ شاعر داشت آنگاہ — کنوں بنگر کہ چوں برگشت از راہ

(الہی نامہ - کلیات صفحہ ۹۳۴ نولکشور)

دوسرا یہ ھے کہ شیخ الاکابر شیخ ابوالقاسم طوسی نے فردوسی کے جنازے کی نماز پڑھنے سے انکار کردیا - رات کو شیخ نے خواب میں دیکھا کہ فردوسی بہشت میں موجود ھے - شیخ کو بڑی حیرت ھوئی پوچھا کہ تمھاری بخشش کیوں کر ھوئی - فردوسی نے جواب دیا کہ ایک شعر توحید کی بناپر بخشدیا گیا—

اسی واقعہ کی طرف ایما کرتے ھوے خاتمۂ مصیبت نامہ میں لکھا ھے۔

می نباید شد بحمداللہ بزور — همچو فردوسی ز بیتے در تنور

همچو فردوسی فقع خواهم کشاد — چوں سنائی بے طمع خواهم کشاد

رابعہ بنت کعب القصداری کے درد ناک حالات کے متعلق جو رودکی کی معاصرہ شاعرہ ھے عطار ھم کو بالکل جدید اور تفصیلی* اطلاع دیتے ھیں —

(دیکھو الہی نامہ صفحہ ۱۸ - ۹۲۷)

---

* تفصیل کے لئے دیکھو اوریئنٹل کالج میگزین بابتہ ماہ مئی سنہ ۱۹۲۵ ع جہاں راقم نے رابعہ پر ایک علحدہ مضمون لکھا ھے—

علاوہ ہذا فخرالدین اسعد گرگانی اور سبب تالیف ویس و رامین کے سلسلہ میں الہی نامہ صفحہ ۲۱-۸۲۰ میں ایک دلچسپ حکایت آتی ہے جو ہمارے لئے جدید معلومات کا حکم رکھتی ہے—

شعرا میں ازرقی، انوری، شہابی، عنصری اور خاقانی کا نام مصیبت نامہ میں آتا ہے، ان کے علاوہ سلطان سنجر، اس کی بہن صفیہ، نظام‌الملک خواجہ رکن‌الدین اکاف کے متعلق ان کے ہاں جدید اطلاع موجود ہے اور مشائخ کے حالات و مقولات کے لئے تو یہ مثنویاں بیحد ضروری ہیں—

تجدد ادبی ایران

مترجمہ

(جناب مولوی سید وھاج الدین صاحب بی اے بی ٹی اورنگ آباد کالج)

[اپریل سنہ ۲۵ء کے رسالہ اُردو میں آقا رشید یاسمیدی کا ایک مضمون "ادبیات ایران در زمان مشروطہ" کے عنوان سے مع ترجمہ شایع ہو چکا ہے - ذیل کا مضمون جو اسی موضوع پر ہے، لیکن تحقیق ادبی اور جامعیت کے اعتبار سے اس سے بڑھا ہوا ہے، ایک فاضل ایرانی نوجوان، جناب رضازادہ شفق تبریزی کے ایک لکچر کا ترجمہ ہے، جو اب سے دو سال پہلے دارالفنون طہران میں دیا گیا تھا؛ اور اب دیوان عارف قزوینی (مطبوعہ چاپ خانۂ مشرقی برلن) کے دیباچے کے طور پر چھپا ہے —

جن حضرات نے جدید اُردو ادب اور خاص کر اُردو شاعری کے ارتقا پر غور کیا ہے، یا اس میں حصہ لیا ہے، ان کے لئے یہ مضمون بہت کچھہ سبق آموز ہو گا - 'تہذیب الاخلاق' کے مضامین' اور حالی مرحوم کی نظموں نے جس 'نیچرل شاعری' کی تلقین آج سے تیس چالیس سال پہلے کی تھی، اس پر آج کل ایران میں بھی زور دیا جا رہا ہے - اس مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ تقلید کی جن منزلوں سے گزر کر ہماری شاعری آج کل اپنا ایک مخصوص قالب تیار کر رہی ہے، وہ ایرانی شاعری نے ابھی طے نہیں کی ہیں - قدیم ایرانی شاعری کی جن کوتاہیوں کو فاضل مضمون نگار نے واضح کیا ہے، وہ وہی ہیں جو متاخرین شعرائے اُردو کے یہاں پائی جاتی ہیں — مترجم]

علماے نفسیات اس حقیقت سے بخوبی واقف ھیں کہ روح اور زبان کا آپس میں چولی دامن کا ساتھہ ھے، اور ان میں سے ایک کی وسعت اور انکشاف دوسرے کی وسعت اور انکشاف پر کس حد تک منحصر ھے - قوانین معاشرت کے عالم جانتے ھیں کہ چونکہ انسانی معاشرت نسل انسانی کے تجربوں کی وجہ سے بڑھتی ھے، اس لئے آج کل اس میں آے دن ترقیاں ہو رھی ھیں - سچ پوچھو تو اس قول کی صداقت کے لئے ماھروں اور عالموں کی تصدیق کی بھی ضرورت نہیں ھے؛ اس لئے کہ آج دنیا میں ھر طرف علوم کے آثار نظر آتے ھیں، اور ھر جگہ محیرالعقول صنعتیں پیدا ھو رھی ھیں - آج کل کے دانش مند آفتاب تک پہنچتے ھیں، اور مشتری تک کی خبریں لاتے ھیں - خچر کو جو کبھی ھماری سواری میں رھتا تھا آج کوئی پوچھتا تک نہیں - اونٹ کی جگہ اب ریل نے لے لی ھے - اس زمانے کے دانا کبھی تو عقاب کی طرح سے ھوا میں اُڑتے ھیں، اور کبھی مگر مچھہ کی مانند زیر آب چلتے پھرتے ھیں؛ ایک سکنڈ میں ھزاروں کوس کی خبر، اور وہ بھی بے تار کی، لاتے ھیں؛ ایک نشانے میں قلعوں کے دو ٹکڑے کر دیتے ھیں؛ بیماري کے دیو کو جو اب تک چھپا ھوا تھا، اپنی آنکھوں سے دیکھتے ھیں؛ اور افسوں اور جادو کرنے والوں کے طلسم سے نہیں ڈرتے؛ قالین سلیمانی پر بیٹھتے ھیں؛ رخش رستم کے منہ میں دھانہ لگاتے ھیں؛ سیمرغ جاودانی کو اپنے پہاڑوں میں لے جاتے ھیں؛ اور سکندر کی مشک سے آب حیات پیتے ھیں - مختصر یہ ھے کہ انسان آج اس قابل ھو گیا ھے کہ فطرت کی قوتوں کو رام کرلے، انھیں اپنی مادي ضرورتوں کی تکمیل کا پابند بنالے، اور بجلی کی طرح اپنا راستہ طے کرے - یہ سب ترقیاں عقل انسانی کے بڑھتے ھوے تجربوں اور اس کی کارکردگی کا نتیجہ ھیں - یہ سب کچھہ ھے، لیکن اگر مغربی ممالک کی ترقیاں صرف انھی مادی ترقیوں ھی کی حد تک ھوتیں، تو وہ کبھی ھماری قدر و منزلت کی اتنی زیادہ مستحق نہ ھوتیں جتنی اب ھیں - مگر ان کی ادبی ترقیاں بھی اسی پاے کی ھیں - اگر آج

کوئی شخص سو جلدیں بھی اسامی کتب کی لکھے، اور ان میں اُن تصنیفات کا مختصر سا بیان لکھے جو زمانۂ جدید میں مختلف فنون کے متعلق چھپ چکی ھیں، تو بھی وہ اپنا فرض پوری طرح ادا نہ کرسکے - اس کا ایک ثبوت تو یہی ھے کہ جو موضوع مطلوب ھو اُسے دنیا کی کسی مشہور قاموس العلوم مثلاً انگریزی قاموس العلوم (Encyclopaedia Brittanica) میں دیکھو، اور غور کرو کہ صرف اسی ایک موضوع پر جتنی کتابیں مؤلف کے علم میں چھپ چکی ھیں ان کی تعداد کس قدر ھے؟ آج کل علم کا دائرہ اتنا وسیع ھوگیا ھے کہ اسے طبعاً الگ الگ شعبوں میں تقسیم کر دیا گیا ھے - ھر شعبے کا اپنا الگ ادب، اپنی مخصوص مستقل تصنیفات اور ماھر موجود ھیں، اور لوگ اپنی ساری ساری عمریں اسی ایک شعبے کی تحقیق اور استقصا میں خرچ کر دیتے ھیں —

اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ فن تاریخ میں تقریباً ایک سو شعبے ھیں، تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ھے - ممکن ھے کہ ایک شخص صرف تاریخ ادیان ھی کے متعلق کام کرتا ھو، اور صرف ایک دین کے ظہور، اساس، تعلیم، اثرات اور احکام کی تحقیق میں اس کی پوری زندگی صرف ھو جاے - یا ایک شخص تاریخ السنہ کے متعلق تحقیق و تلاش کرے، اور اپنی عمر صرف ایک زبان کی پیدائش، اشتقاق اور اس کی ادبیات کے ماضی اور حال کے مطالعہ میں خرچ کر دے - مذکورۂ بالا بیان سے معلوم ھوتا ھے کہ تاریخ کے جیسے ایک آسان علم کی وسعت بھی کتنی زبردست ھے، کہ اگر ھم صرف اسی کے شعبوں کو گننے بیٹھیں: مثلاً تاریخ السنہ، تاریخ جنگ، تاریخ معاشیات، تاریخ فلسفہ، فلسفۂ تاریخ، تاریخ علوم، تاریخ ادبیات، تاریخ انسان، تاریخ اقوام، تاریخ عتیق، تاریخ حروف وغیرہ وغیرہ، — تو ایک اچھی خاصی فہرست تیار ھوجاے - اگر کوئی شخص صرف اِسی حقیقت پر غور کرے کہ موجودہ زمانے میں کسی ایک مملکت کی تاریخ پر حاوی ھونا

اور اُس میں ماہر بننا بجاے خود ایک مستقل علم کی حیثیت رکھتا ھے' تو اِس سے ھمارے مذکورۂ بالا بیان کي تائید ھوجاے - مثلاً آج کل بھی علمائے مصریات (Egyptology) ' تاریخ یونان ' کلدہ اور بابل کے ماھرین خصوصی ' اور تاریخ ایران کے محققین موجود ھیں ' اور بلند رتبہ حاصل کر چکے ھیں - اِسی طرح سے مذھبی ادب ' اور وہ بے شمار کتابیں جو مذاھب ' اور خاص کر مذھب عیسویت کی تاریخ و ماھیت کے متعلق لکھی جا چکی ھیں : نیز اُن کی جو تفسیریں ' تقریظیں ' تردیدیں تنقیدیں اور نقلیں چھپ کر شایع ھوچکی ھیں ان کی تعداد اتنی زیادہ ھے کہ اُس کا تصور کرنا ھماری قدرت سے باھر ھے —

مذکورہ بالا مختصر بیان سے یہ بھی معلوم ھوتا ھے کہ اصطلاحی معنوں میں بھی ادبیات (یعنی لٹریچر) کس قدر وسیع ھوگئی ھے : اس لئے کہ جتنی زیادہ علوم اور مطبوعات میں ترقي ھوئی ادبیات بھی اتنی ھی زیادہ بڑھی - اگر آج کوئی شخص یہ چاھے کہ ادبیات عالم کا ذوق صحیح معنوں میں پیدا کرے ' تو اس کے لئے یہ ضروری ھے کہ پہلے اپنی تمام عمر دنیا کی ادبی تاریخ اور اُس کے مختلف شعبوں میں صرف کردے ' اور یونان قدیم کے ھومر (Homer) اور ھسیود (Hesiod) سے شروع کرکے شکسپیر انگریزی ' ھیو گو فرانسیسی ' گیٹے جرمانی ' تالستائے روسی ' دانتے اطالوی ' امرسن امریکی ' ابسن اسکینڈنی نیوی ' امراء القیس عربی ' ٹیگور ھندی ' اور ان کے بے شمار ھم عصروں ' نیز چین ' جاپان ' ترکی وغیرہ کے شعرا کی تحقیق و تدقیق کرے - صرف ایک فرانسیسی ادبیات ھی جب سے کہ اس کی داغ بیل پڑي ھے یعنی آٹھویں صدی عیسوی سے لیکر آج تک ایک سو اعلیٰ پایہ کے شاعر اور مصنف پیدا کر چکی ھے' اور دوسرے درجہ کے مصنفوں کی تعداد تو کئی سو ھے - دنیاکی ھر بڑی قوم' حتی کہ دوسرے درجہ کي قوموں کی ادبی تواریخ کا بھی یہی

حال ہے - اگر دنیا کے اس ادبی پہلو کا اور دوسری علمی ترقیوں کے ساتھ جن کا نمونہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے مقابلہ کرو، اور ان میں جو تناسب پایا جاتا ہے اُسے ذہن میں رکھو، تو معلوم ہوگا کہ دنیا کے اختراعی احساسات جن کی جلوہ گاہ ممالک مغربی ہیں آج کس درجہ بلند اور اعلیٰ ہو گئے ہیں —

انسانی اعصاب ہی افکار انسانی کا منبع ہیں، اور وہ ترقی پزیر ہوتے ہیں - اس قضیہ کی رو سے، قوموں کے احساسات ادبی کی توسیع افکار کے دوسرے شعبوں کی توسیع کے اعتبار سے ہوا کرتی ہے - مغربی قوموں نے اپنی علمی اور ادبی ترقیوں کی وجہ سے اخیر کے چند قرنوں میں مشرقی قوموں پر سبقت حاصل کرلی ہے- اسی وجہ سے ان کا محیط* اور اُن کے افکار بہت بلند ہو چکے ہیں - اُنہوں نے اِن دونوں کو رقیت† اور نادانی کی قیدوں سے آزاد کردیا ہے، اور ان کے فطری نشوونما کے لئے زمین تیار کردی ہے —

شروع شروع میں فکر انسانی جتنی سادہ تھی اتنی ہی آزاد بھی تھی - آگے چل کر بعض تیز طبع اشخاص کی وجہ سے اس میں مرکزیت پیدا ہونا شروع ہوئی، اور ابھی بہت زمانہ نہ گزرا تھا کہ لوگ انہی اشخاص کی روش کو اپنا نمونہ بنانے لگے؛ اور تھوڑی ہی سی مدت میں قاعدے اور طریقے بن گئے، اور اولاد آدم کو ان قاعدوں کی پیروی کا پابند بننا پڑا - خاص کر قرون وسطیٰ میں تو ذاتی اور مستقل فکر بالکل ہی اُٹھ گئی، اور اگلے لوگوں کے قاعدے اٹل دستورالعمل قرار دئیے گئے - بالفاظ دیگر جہاں پہلے

---

* اُردو میں آج کل اس موقع پر ماحول کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے - ہماری رائے میں لفظ محیط صرف خوبصورت ہی نہیں ہے بلکہ (Environment) کے مفہوم کو زیادہ صحیح طور پر ظاہر کرتا ہے- مترجم —

† ضعف احساس، جا و بےجا رقت، اور سوز و گداز سے کام لینا - انگریزی میں اسے (Sentimentalism) کہتے ہیں — (مترجم)

اقتداء کا وجود تھا، وہاں اب تقلید پیدا ہوگئی - کسی مقصد کے ثابت کرنے کے لئے صرف افلاطون یا ارسطو کا نام لے دینا ہی کافی سمجھا جانے لگا اور علم برداران علم کا ہتھیار محض صغریٰ اور کبریٰ کی ترتیب ظاہری، یعنی لفظ بازی بن گیا - کلیسا کے احکام، راہبوں کی بیان کی ہوئی حدیثیں، طلسم ہائے رویین اور موبدوں کے قائم کئے ہوئے نمونے —— یہ دین و آئین سمجھے جانے لگے - مختصر یہ ہے کہ یہ دور، دور تقلید تھا، اور ہر مسئلہ کا حل دلائل نقلی، یا خشک اور مصنوعی منطق سے کیا جاتا تھا - اس حالت میں ضروری تھا کہ فکر کی قید و بند کا یہ زمانہ ختم کیا جائے، اور اس جکڑ بند اور الجھن کا رد عمل شروع ہو - چنانچہ یہی ہوا - تکمیل نے اپنا کام کر دکھایا - بعض دماغوں میں آزاد خیالی کا نور جگمگا اٹھا، اور اِس نے اُس عہد مفقولات کی تاریکی پر معقولات کی بجلی گرای اور کچھ کچھ لوگ اس کی طرف متوجہ ہونے لگے - زیادہ زمانہ نہ گزرنے پایا تھا کہ نشاۃ ثانیہ (رنے سانس) کا دور شروع ہوگیا - اس دور کی خصوصیت یہ تھی کے ترک تقلید اور شروع اجتہاد کو اپنا عقیدہ بنا لیا جائے ——

اس دور کا اثر مغربی اقوام کی زندگی کے ہر شعبہ پر پڑنے لگا، اور قدرتی طور پر افکار ادبی میں بھی رو نما ہوا - قواعد کے طوماروں کی وقعت کم ہونی شروع ہوئی، اور نئے اہل قلم قدماء کی زیب وزینت اور نقش و نگار کے بجائے، اب محیط حاضر اور اپنے ہمعصروں کے فطری احساسات کی تصویر کی طرف متوجہ ہونے لگے - لاتینی زبان اور اس کے ادق جملوں اور عبارتوں پر انحصار کرنا چھوڑ دیا گیا؛ قومی زبانیں پیدا ہونے لگیں؛ اور ادبیات میں بھی کسی قدر احساسات قومی کا ساتھ دیا جانے لگا - اس آزادی کے تھوڑے ہی زمانے بعد دور تجدد اور بعد کو دور رومانیت (Romantism) شروع ہوا - رومانیت کی ایک دو جملوں میں تعریف کردینا آسان نہیں ہے - بلکہ اس دور کے شاعروں کے افکار پڑھ کر اس کا احساس کرنا، اس کی تعریف اور توضیح سے کہیں زیادہ آسان ہے - جب

مشہور فرانسیسی شاعر وکٹر هیوگو نے اپنی اس کتاب کے مقدمہ میں جو اس نے کرام ول (Crom well) کے متعلق لکھی تھی ' رومانیت کے موضوع اور اس کی تعریف کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کئے تھے ' تو اکثر لوگ اس کے مطلب کو صحیح طور پر نہ سمجھہ سکے تھے - اس لئے کہ رومانیت ' دراصل ایک طرح کا انقلاب تھا ' اور انقلابوں کی تعریفیں اور قاعدے نہیں هوا کرتے - اس دور کے اشعار سمجھنے اور قدیم ادبیات کے اصولوں کے ساتھہ اس کا مقابلہ کرنے کے لئے حسب ذیل مواد پیش کیا جاتا ھے : —

(۱) دور تجدد ' اور اس کے بعد دور رومانیت نے ادبی مسلک کو " آفاق " سے نکال کر " انفس " میں رکھدیا - اس دور سے پہلے کے معمولی اشعار زیادہ تر صرف قواعد اور اگلے لوگوں کے طور طریقوں کے تابع هوا کرتے تھے ' اور شاعر کی محنت صرف پیرایۂ الفاظ ' تضمین افکار و قواعد منقولہ کی نذر هوا کرتی تھی - اس زمانے میں شاعر ایک درزي کی مانند ' اپنا لباس اس طرح سیا کرتا تھا کہ قواعد کے جسم پر ٹھیک بیٹھے ' اور اگر چہ یہ لباس آرائش ' عرض اور طول میں پوری طرح ٹھیک اور مُتنا سب هوتا تھا ' لیکن ظاهر ھے کہ اس کی حیثیت صرف ایک لباس ' یا ایک نمونے کی نقل کے سوا اور کیا هو سکتی تھی - دور تجدد نے اس جکڑ بند کے اصول کو مٹا کر ظاهری آرائش کو اندرونی احساسات کا تابع بنایا - دوسروں کے اساطیر اور سوانح کی جگہ شخصی هیجانات اور خیالات نے لے لی - جو کچھہ سلف کی کتابوں میں لکھا هوا تھا ' اس کی آرائش ' اور زیبائش کی بجاے اب شاعر نے خود اپنے سر کے " شورو سودا " کو تحریر میں لانا اور پڑھنا شروع کیا - اس کے ساتھہ هی ساتھہ ' سلف کی تصنیفات میں جو باتیں اُسے اچھی نظر آئیں انھیں بھی اس نے محض کورانہ تقلید کی بنا پر نہیں ' بلکہ سمجھہ کر اور پسند کر کے لیا ' خاص کر رومانی شاعروں نے اگلے لوگوں کے فطری (نہ کہ مصنوعی) احساسات ' حتی کہ قرون وسطی کے تاثرات اور افکار کو

بھی اپنے نرالے انداز میں نئے سرے سے زندہ کیا —

یہ زمانہ انقلاب کا زمانہ تھا - انقلاب ماضی کی شکستہ بنیادوں کو اُکھیڑنے کے لئے ہوا کرتا ھے ' اور جب یہ پرانی بساط الٹ جاتی ھے تو احساسات اور افکار میں ایک نئی وسعت پیدا ھو جاتی ھے ' اور شخصی آزادی وجود میں آجاتی ھے - چنانچہ دنیاے ادبیات میں بھی یہی ھوا - پرانے نمونے نظروں سے گر گئے ' اور نئے شعرا نئے افکار اور نئے الفاظ لانے لگے - انگلستان میں برنس ' (Burns) ' شیلی (Shelly) ' کیٹس (Keats) ' بائرن وغیرہ ؛ فرانس میں هیو گو (Hujo) لامارتین (Lamartine) الفرد دوینی (A. Viginie) وغیرہ اور جرمنی میں گے تے (Goethe) شلر (Schiller) هائنا (Heine) اور انھیں کے جیسے دوسرے لوگ پیدا ھوے - اگرچہ ان میں سے اکثر اپنے وطن کے دور روسانیت میں نہیں گزرے ھیں اور رسماً کلاسک (قدیم) بھی تھے ' لیکن تجدد کی بنیاد دراصل انھی لوگوں نے رکھی ھے - ان مشہور اور جوان روح شعرانے خاص طور پر اپنے انقلابی اور ادبی احساسات کو قلمبند کرنا اپنا شیوہ بنایا - اپنے ھمعصروں کے حالات ' ان کی خوبیاں 'کوتاھیاں' ان کے میلانات اور عادتوں کا بیان کرنا ؛ یا قوم کے تاریخی دوروں کا حال لکھنا : یہ اعلی درجہ کے اشعار کا موضوع بنا - حس انانیت جسے فرانسیسی (Sentiment de moi = احساس ذات) کہتے ھیں اور سب چیزوں سے بالا ھوگئی - اهل قلم افراد کی کثیر تعداد خود اپنے خیال کی ترجمانی کرنے لگی - اس لئے جو کچھ انھوں نے لکھا سر سے نہیں بلکہ دل سے لکھا : یعنی قواعد اور منقولات کی تضمین کی بجاے ' حسیات کی تعبیر کی —

(۲) جب کبھی ادبیات کا تعلق عالم دل سے ھو گا تو وہ لازمی طور پر سچی اور فطری ھو جاے گی - جب اهل قلم حضرات نے اپنے اشعار کو اپنی حسیات کا آئینہ بنا لیا تو ضروری تھا کہ تکلفات و صنائع کی بجاے صداقت پیدا ھو جاے - دوسروں کی پیروی اور اُن کی ھر چیز کو پسند کرنا جو قرون وسطی کا شیوہ

تھا ، اِن لوگوں میں نہ تھا ، اور جنگ ترانے یا حواریوں کی سوانح عمری، یا شاہ شارلمان کے زمانے کے حالات لکھنا اب ترک کر دیا گیا تھا —

(۳) جب لوگوں نے صداقت کے ساتھ ساتھ مطالعہ نفس بھی کرنا شروع کیا؛ تاریخ سلف کا مطالعہ اور پرانی تصنیفات کی قدر دانی (جس کی نشاۃ ثانیہ اور بعد کو روما نیت نے خاص طور پر تعلیم دی تھی) خصوصیات شاعر میں داخل ہوگئی ؛ اور ان سب سے بڑھکر ایک بات اور پیدا ہوگئی : یعنی شاعر نے ہر چیز کا مطالعہ گہری نظر سے کرنا شروع کیا ، نیز وہ شور اور ہیجان کے زمانے میں پیدا ہوا —— تو ان سب باتوں کا ملا جلا اثر یہ ہوا کہ شاعری کی ممتاز ترین صفت یعنی حساسیت بڑھنا اور کامل ہونا شروع ہوئی - یہی وجہ ہے کہ دور تجدد اور خاص کر عہد رومانیت کے شاعر اور کچھہ ہوں یا نہوں ، لیکن حساس بہت زیادہ تھے - جس وقت کہ پرانے خیال کا شاعر راحت کے وقت ، نہایت سکون اور طمانیت کی حالت میں بیٹھا ہوا ، عروض و قوافی کی رو سے نئے نئے مضمون ، اور اپنی قدرت کے موافق قافیہ پیدا کیا کرتا تھا —— عین اسی وقت رومانی شاعر رات کے وقت کسی سبزہ زار میں یا آبشار کے کنارے لیٹا ہوا ، جلوۂ شب ، ماہ نخشب ، عطر ریاحین اور بوے یاسمین سے مست اور بیخود ہو کر اپنی حسیات کی فضامیں اُڑتا تھا ، اور اس جلوۂ جمال کے عشق کا راگ گاتا تھا - کبھی صدای بلبل یا تماشاے گل اس کے لئے کافی ہوتا تھا کہ اس کے شور و سودا کو ٹھیس دے ، اس پر حالت وجد طاری کردے ، اور وہ فطرت کے افسونوں کا عاشق بن کر اس کی اتنی تعریفیں کرے ، اور ایسے ایسے راگ الاپے کہ خود اس پر وجد کی انتہائی حالت طاری ہو جاے ، اور وہ گھنٹوں احساسات سے لبریز ، لیکن خاموش ، ماہ درخشاں کے نور میں ڈوبا ہوا رہے - انگریزی شاعری کے اس دور کے بعض شاعر جیسے شیلی ، کیٹس ، اور اسی طرح بعض فرانسیسی شعرا بھی اس قسم کے قدرتی مناظر کے احساس اور افسون پر اتنے مایل ہوگئے

ھیں کہ اس قسم کے موقعوں پر ان کی راگنیوں میں وحدت وجود کا رنگ جھلکنے لگتا ھے —

یہ لوگ عشق اور ھیجان کے راگ گانے والے، یابقول انگریزوں کے لرک (Lyric) شاعر تھے —

(۴) حساسیت اور صداقت کے التزام کے ساتھہ ھی ساتھہ، فرط محبت و عشق بھی نئے اھل قلم اور دور رومانیت کے شعرا کی خصوصیت تھی- رومانی شاعر مجسم عشق ھوا کرتا تھا- عشق گل، عشق بلبل، جمال فطرت کا عشق، انسانی "گل بوتوں" کے عشووں کا عشق——یہ سب اس میں ھوتے تھے -ایک مرتبہ جب برنس (Burns) زمیں کھود رھا تھا، اور غفلت کی وجہہ سے ایک گلاب کی جھاڑی جڑ سمیت اس کے ھاتھہ میں آگئی تھی، تو اسنے انتھای الم سے متاثر ھوکر اس جھاڑي کی بد نصیبی کے متعلق شعر کھے تھے! بائرن، گیٹے، لامارتین اور انھی کے جیسے دوسرے شعرا کے شاعرانہ اور لبریز احساسات معاشقہ نے عشق کو جنون کی حد تک پھونچا دیا ھے- اگر کوئی شخص فرانس کے حساس شاعر الفرد دمسا کے "اعترافات" کو پڑھے، تو اُسے معلوم ھوجائے گا کہ اس مسحور کن عشق کا جنوں کیا انتھا رکھتا ھے—

شاعر متجدد کے خیالات اور احساسات عشق سے سوز و گداز کی طرف، اور سوز و گداز سے عشق کی طرف پھرتے رھتے تھے؛ اور وہ فی الحقیقت ان دو قوتوں کے ھاتھہ میں ایک کھلونے کی طرح تھا- علاوہ بریں شاعر کو خود اپنے عشق سے بھی عشق تھا- وہ خود آتش عشق کا جویا رھتا تھا، اور بقول عارف کہا کرتا تھا:—

میخواھم آں کہ عشق بکاھد چناں تنم

کافتم بہ شبہ کایں پر کاھست یا منم الخ

یہ اسی قسم کے احساسات کا تقاضا تھا کہ لامارتین نے اپنے یادگار صحائف عشق لکھے، اور انگریزی شاعر کٹیس نے ھر جمیل چیز کو مسرت

دائمی کا سر چشمہ سمجھا* اور ایک دوسرے شاعر کالرج نے کہا —

بہتر آں زیست کہ در عشق بتاں بہتر شد†

اور گیٹے نے عشق کو "تاج حیات" کہا‡ - اسی طرح سے حکیم نظامی نے حکم لگایا کہ :—

دلے کز عشق خالی شد فسردہ است

اور خواجہ حافظ نے عاشقوں کے نام کو "جریدہ عالم" پر "ثبت" کیا' اور مولانا رومی نے فرمایا :—

ھر کرا در سر نہ باشد عشق یار

بھر او پالاں و افساری بیار

اور سعدی (رح) نے راہ عشق میں جانبازی دکھانے کے لئے پروانے کو نمونہ بنایا$ وغیرہ

مختصر یہ ھے کہ عشق و محبت ھی شاعر کے دفتر احساسات کا سر ورق ھوتے تھے' اور اس کا ادبی ذوق بھی اسی میدان میں خوب خوب تجلیاں دکھاتا تھا۔ اسی کو ایک لفظ میں یوں کہہ سکتے ھیں کہ وہ اسیر دل تھا' اور اپنے محبوب کے عشق کی راہ میں شیراز کے شاعر کا ھمنوا ھو کر یہ صدا لگاتا تھا کہ —

" درویشی و انگشت نمائی و ملامت ھمہ سہل است"

شاعر کی راہ دل میں یہ جاں بازی' یا اسیری خود ساختہ نہیں بلکہ فطری تھی' اور رومانی اور کلاسک (قدیم) شعرا میں اصل فرق بھی یہی ھے -

---

* "A thing of beauty is a joy for ever" Keats.

† "He liveth the best, who loveth the best" Coleridge.

‡ Die krone des Lebens= زندگی کا تاج' Goethe

$ شیخ کے اس شعر کی طرف اشارہ ھے :—

اے مرغ سحر عشق زپروانہ بیآموز

کاں سوختہ را جاں شد و آواز نیامد (مترجم)

جس وقت کہ فرانسیسی شاعر موسے (Musset) نے یہ الفاظ کہے تھے" میں اپنی برائی، خوش قسمتی، حتیٰ کہ بد قسمتی تک کا ذکر زبان پر نہیں لاتا، بلکہ اپنی زبان کو بند رکھہ کر، اور خامشی کے ساتھہ دل کی گفتگو کا منتظر رہتا ہوں" تو اس کا یہ بیان لفاظی نہیں بلکہ بیان حال تھا —

غرض کہ اس قسم کے سچے عشق، اور عاشقانہ حسیات کے آزادانہ بہاؤ کی وجہ سے دنیاے ادبیات میں ایک نہایت جیتا جاگتا اور اہم عنصر پیدا ہوگیا۔ یہی وہ فطری ادبیات تھی جس نے آخر چلکر Naturalism = طبیعیت کے نام سے ایک نیا اور مستقل مذہب ادب پیدا کردیا۔ دور تجدد اور دور رومانیت کے شاعر اگرچہ متصوف، مغلوب احساسات اور معذوریات میں ڈوبے ہوے تھے، لیکن چوں کہ ان کے خیالات سچے تھے، اسلئے وہ فطری اور طبیعی بھی تھے۔ ان کی تحریروں میں، خصوصاً متقدمین کے یہاں عبارت آرائی اور تصنع کو زیادہ اہمیت نہ دی جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ رفتہ رفتہ احساسات کی طبعی اور فطری تصویر کھینچنا معمول بن گیا : یعنی شاعر بھی ایک چابکدست نقاش کی طرح اپنے احساسات عشق و محبت کی تعبیر میں تناسب کا خیال رکھنے لگا، اور اس نے حقیقت حال کو مبالغہ اور ظاہری آرائش پر قربان نہ کیا - لامارتین نے ایک اطالوی لڑکی " گرازیلا " کے ساتھہ اپنے عشق کی جو داستان بیان کی ہے، وہ تمامتر فطری اور اصلی روداد ہے؛ اور اگر چہ وہ دوسروں کی طرح سے اپنے معشوق کی تصویر کے لئے آھو، کبوتر، سرو، اور صنوبر کا محتاج نہیں ہوا؛ لیکن پھر بھی اُسنے اپنے اور اپنی محبوبہ کے فطری عشق، اور اس عشق کے تمام تاثرات، ہیجانات، اور احساسات کا نقشہ اپنے قلم سے کھینچ کر رکھہ دیا ہے، اور اس طرح عشق کی ایک جیتی جاگتی تصویر بنادی ہے —

واضح رہے کہ سادگی سے مراد عامیانہ تحریر نہیں بلکہ فطرت کی لطافتوں کی نقش کشی ہے: جیسے کوئی مصور بہترین اور لطیف ترین رنگوں سے کام

لیکر فطرت کے کسی جھیل منظر کو بے کم و کاست مجسم بنا کر دکھا دیتا ھے - ورنہ اگر فطری تصویر کے معنے یہ ھوں کہ ایک خشک اور جھوتی ترسیم بنادی جاے ' تو اگلے وقتوں کے لوگوں کے یہاں بھی یہ چیز ضرور نظر آتی - (حقیقت یہ ھے کہ اس نقطۂ نظر سے دیکھا جاے تو بعض رومانی شاعروں پر حسیات کا رنگ ' رنگ فطرت پر غالب نظر آتا ھے) اگر اس دور کے اکثر اشعار کو پڑھا جاے ' اور ان کے بدایع کا نقش کھینچا جاے تو سنسار کی رنگینوں اور بو قلمونیوں کی ایک سچی تصویر تیار ھو جاے - غرض کہ عصر حاضر کے اور رومانی شاعروں کی امتیازی صفتیں یہ ھوتی ھیں :- احساسات نفسی ' سچائی ' فرط عشق و محبت ' شور و وارفتگی ' فطری تصویر ' تصنع سے پاک ھونا ' حتی کے کبھی کبھی تصوت اور وحدت الوجود کی روح کا بھی موجود رھنا (شق آخر مشرقی ادبیات میں خاص اھمیت رکھتی ھے)—

یہ خیال نہ کرنا چاھئیے کہ مذکورہ بالا اوصاف صرف ایک ھی زمانے یا آدمیوں کے صرف ایک ھی گروہ پر منحصر' اور انھیں کے ساتھہ قطعی طور پر مخصوص ھوتے ھیں ؛ اس لئے کہ جیسا کہ کسی کا قول ھے ' دنیا کی کوئی چیز بالکل نئی اور تازہ نہیں ھوا کرتی - ھومر کی لکھی ھوئی جنگ ترائے کی کہانیاں ' یا روم کے شعرا اوید (Ovid) اور ورگیل (Virgil) کی تصنیفیں ؛ شعرائے عرب میں سے امراءالقیس اور انھیں کے جیسے لوگ عناصر رومانیت سے ھر گز محروم نہیں ھیں ؛ اور فارسی زبان میں فردوسی کی یوسف زلیخا سے لیکر نظامی کی شیرین و خسرو تک جو عشقیہ حکایتیں موجود ھیں ان کا تو کہنا ھی کیا ھے - لیکن ایک فرق بے شک ھے ' اور وہ تفاوت زمان ھے - یہ کیسے ھو سکتا ھے کہ ان لوگوں کے احساسات جن کا زمانہ زمانۂ ابتدای تھا ' اور جن کے صنایع اور علوم محدود اور مقید تھے ' اٹھارویں اور انیسویں صدی کے لوگوں کے احساسات سے ٹکر کھائیں :

اس لئے کہ یہ صدیاں ، قومی بیداری ، علم اور صنعت کے ظہور ، نیز سیاسی انقلابوں کی صدیاں تھیں - ہر دور کی ایک الگ حس ، اور ہر حِس کی ایک الگ تعبیر ہوا کرتی ہے ، اور اگر ادبی مسلک ارتقاے معاشرت کے قانون کا ساتھہ نہ دے ، یعنی ثانی الذکر متحرک اور اول الذکر ساکن ہو ، تو فطرت کی رفتار اُلٹی ہو جاے - یہی وجہ تھی کہ جس وقت فرانس کے انقلاب پسند قلعہ باستیل کی بنیادیں اکھاڑ کر دوسرے پرانے اصولوں کے قلعے مسمار کر رہے تھے ، عین اسی وقت ادبی شورش پسند بھی بقول وکٹر ہیو گو ، اگلے لوگوں کے بناے ہوے قواعد اور ادبی زنجیروں کو توڑ رہے تھے * —

اس تمہید کے بعد ہم اپنے اصل مضمون یعنی تجدد ادبی ایران کی طرف متوجہ ہوتے ہیں ، اور اس کے متعلق اپنے نظرئے بیان کرتے ہیں - ہم نے نظرئے کا لفظ قصداً اس وجہ سے استعمال کیا ہے کہ ہمیں یہ معلوم ہے کہ اجتماعی مسایل پر حکم لگاتے وقت ادعای بیانات کرنا اور اپنے نفس پر اعتماد کرنا غلطی ہے ؛ اس لئے کہ ایسے موقعوں پر اگر ذرا سا سہو بھی ہو جاے ، تو اس سے حقوق عمومی میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہوا کرتا ہے - اگر ایران اپنے اجتماعی مسائل کے اعتبار سے (کہ جن میں سے مسئلہ ادبیات بھی ہے) اس دور میں قدم رکھہ چکا ہے ، تو اس کا قدرتی فرض یہ ہے کہ اپنی مادی اور معنوی کوتاہیوں پر نظر رکھے ، تا کہ آئندہ فائدے میں رہے - لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ "آزادی مطلق" کا اصول کسی اجتماعی کام پر صادق نہیں آتا ، اور اسی وجہ سے ادبیات پر بھی اس کا اطلاق نہیں ہو سکتا - محض انقلاب اور جدت کو عذر بنا کر عنان قلم ہر نا تجربہ کار نوجوان کے ہاتھہ میں نہیں دی جاسکتی ، اور ایک پوری قوم کے ذخیرۂ ادبی کو حسیات خام کا کھلونا ، اور جملہ سخن کو ادبی مزدوروں کی

---

* "J'ai pris et demolis la Bastille des rimes"

Victor Hugo

بازی گاہ نہیں بنایا جاسکتا - اسی وجہ سے راقم الحروف بھی اگرچہ اس کی باتیں سچی ہیں، اور اس کا ان پر قوی ایمان بھی ہے لیکن وہ اپنے آپ کو غلطی سے مبرا نہیں سمجھتا؛ اور نہ یہ چاہتا ہے کہ بغیر کافی غور و خوض کے اس کی تحریر کو ادبی دستور العمل مان لیا جائے - وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ "هنوز گویندگان هستند اندر عراق که قوت ناطقه مدد از ایشان برد" اور علمائے ادب کی قدر و منزلت کا پورا احساس اپنے دل میں رکھتا ہے - اس اعتراف کے بعد، راقم سطور هذا یہ کہنا چاہتا ہے کہ ایران کے دوسرے معاشرتی شعبوں کی طرح اس کی ادبیات بھی تجدد کی محتاج ہے - ہماری ادبیات کا قالب بہت اعلیٰ اور ذی قیمت ہے، لیکن اس کی اہمیت بالکل ویسی ہی ہے جیسی کہ استخر کے آثار قدیمہ، کوہ بیستون، اور طاق کسریٰ کی ہے - دوسرے معاشرتی قوانین کی طرح ادبیات کا بھی طفولیت اور شباب، رقوت اور انحطاط کا دور ہوتا ہے، اور اس کے طرفداروں میں بھی اشرافیت پسند، جمہوریت پسند اور انقلاب پسند پائے جاتے ہیں —

اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ اس زمین کے ادبی توشہ خانے میں حضرت سعدی کی قدر و منزلت کی آب و تاب ایک گران بہا موتی کی طرح ہمیشہ ہمیشہ زندہ اور باقی رہے گی، لیکن جب کوئی نئی روشنی کا نوجوان گلستاں کے باب پنجم کی اکثر حکایات، اور استاد کی پھکڑ بازیوں کو سنتا ہے، تو انہیں اسی نظر سے نہیں دیکھ سکتا جس سے کہ دوسرے انہیں دیکھتے ہیں - استبداد سے انقلاب پیدا ہوتا ہے، اور انقلاب سے قدامت پسندی پیدا ہو جاتی ہے، چنانچہ آج ایرانی ادبیات میں بھی اپنا کام نکالنے والے ایسے ایسے پرانے خیال کے لوگ پیدا ہوتے جاتے ہیں کہ جنھوں نے سعدی کے قصاید اور حافظ کی غزلیات سے ایک طلسم تیار کرلیا ہے اور یہ چاہتے ہیں کہ ہر گم راہ نوجوان کو اس سے مسحور کرلیں - یہ لوگ اتنا نہیں سمجھتے کہ افراط و تفریط دونوں برے ہیں —

وہ نوجوان جو صرف و نحو کے تابع اور مغربی ادبیات کے عاشق ھیں، لیکن مشرق کے معنوی مناظر سے بے خبر ھیں وہ ان لوگوں کی طرح ھیں جو بغیر ضرورت کے عینک استعمال کرتے ھیں، یا بے سبب اپنے دانتوں پر سونا چڑھواتے ھیں، یا بے وجہ اونچے اونچے کالر لگاتے ھیں - یہ لوگ "کما نتالہ ور" کا ترجمہ "چہ طور می روید" اور "کمان پرتہ وو" کا "چہ گونہ می برید" کیا کرتے ھیں* یہ لوگ ھیوگو (Hugo) کی تصنیفات پڑھتے ھیں، لیکن سعدی سے بے خبر ھوتے ھیں، شوپن‌هایر کا دم بھرتے ھیں لیکن خیام کو نہیں جانتے، لافنتین کا تذکرہ کیا کرتے ھیں، لیکن کلیلہ و دمنہ سے غافل ھیں —

دوسری طرف پیران ادب ھیں، جو مجسم قافیہ ھیں، اور بغیر "واللہ درالقائل" کے کوئی بات نہیں کہتے - یہ لوگ صنعت مجاز مرسل اور "ردالعجز علی الصدر" کے لئے اپنی جان تک لڑا دیتے ھیں - ادھر ان کے کانوں میں کوئی شعر پڑا، اور انھوں نے استعارہ، ترصیع اور تسجیع کی خورد بین سے اس کا جائزہ لینا شروع کیا - فرنگیوں کے کاھے اور ان کے اسلوب بیان سے یہ اسی طرح بھاگتے ھیں جس طرح کوٹ پہننے والوں سے پرانے جبہ پوش - ان لوگوں کا خیال بس یہی ھے کہ ادبیات کی جو کچھہ کائنات ھے وہ صرف منوچہری کے "کواعب" "نواعب" "سجنجل" "سفرجل" "کیسہ کک" اور "پستانگ" میں؛ یا حافظ کے "سجادے" میں؛ یا خیام کے "کوزے" میں؛ یا فردوسی کے "جوشن" میں؛ یا جلال‌الدین رومی رح کے "کشکول" میں ملتی ھے - اگر کوئی شخص رمل

---

*یہ دو فرانسیسی جملوں Comment-allez-Vous اور Comment portez Vous کے لفظی ترجمے ھیں، حالانکہ در اصل یہ جملے فرانسیسی میں "مزاج شریف" کی جگہ استعمال کئے جاتے ھیں - صاحب مضمون کا منشا یہ ھے کہ بعض نوجوان اپنی زبان کی خوبیوں سے اتنے بے خبر ھیں کہ وہ بے سبب، اور مناسب الفاظ کی موجودگی کے باوجود بھی دوسری زبانوں کا لفظی ترجمہ کیا کرتے ھیں - یہ ویسا ھی ھے جیسا کہ کوئی اُردو میں انگریزی سلام 'Good morning' کا ترجمہ "اچھی صبح" کرے - مترجم -

اور اسطرلاب نہ جانے، باب حادی عشر کی شرح نہ کرسکتا ہو، ایسے اشعار میں جو نظر اول میں عربی اور دوبارہ دیکھنے پر فارسی نظر آئیں؛ شروع سے پڑھو تو بحر متقارب میں ہو، اور دوسرے لفظ سے پڑھو تو ہزج مسدس مخزوم ثابت ہو، اس کے قصیدے سے درخت کی شکل پیدا ہوتی ہو، اور مصرعوں کے پہلے حروف سے ایک سمندر کا نام حاصل ہوتا ہو؛ ایک شعر میں طوفان نوح، آیہ نور، اور واقعہ خیبر کا ذکر بطور ایہام کیا گیا ہو اور ابجد کی رو سے اس سے فلاں سلطان زماں کی تاریخ ولادت نکلتی ہو—— غرض کہ اس قسم کے اشعار میں اگر تمہیں دیکھتے ہی لطف نہیں آتا، اور تم ان کے پیچ در پیچ معنوں کو نہیں سمجھ سکتے، تو تم ان بزرگوں کی رائے میں اہل ذوق نہیں ہو، اور شعر نہیں پرکھ سکتے - اور چونکہ اہل مغرب ان کمالات سے محروم ہیں، لہذا وہ جاہل ہیں، اور ان کے وہ اشعار جن میں آفتاب کے طلوع و غروب، یا غنچوں کے کھلنے اور بند ہونے کا ذکر کیا جاتا ہے، بے مزا اور بے معنی ہیں: اس لئے کہ ان میں کنایہ، استعارہ، نکتہ، تشبیہات، مجاز وغیرہ کا نام تک نہیں! اس تفاوت پر غور کیجیے - ''آش رشتۂ * ما کجا، سوپ سادہ آنہا کجا''——

اصلیت یہ ہے کہ سیدھا راستہ نہ یہ ہے نہ وہ - یہ دونوں گروہ افراط اور تفریط میں مبتلا ہیں - ہمارا مقصد یہ ہے کہ ہر زمانے کا اپنا مخصوص بیان، حتی کہ اپنے الگ احساسات بھی ہوا کرتے ہیں، اور ان احساسات کی تعبیر بھی اس مخصوص زبان میں ہونی چاہئے - مثلاً کسی زمانے میں ایک عاشق اپنے اونٹ پر سوار ہو کر اپنی معشوقہ سے ملنے کے لئے حجاز جایا کرتا تھا، اب اگر حجاز کے بدلے یورپ، اونٹ کی جگہ ریل کی پٹریاں، اور اس زمانے کے محیط کی بجائے موجودہ علم و صنعت کا محیط ہو، تو ظاہر ہے کہ عاشق کی واردات اور احوال

---

* ایک قسم کا ایرانی کھانا ہے، جس میں سویاں، اور کئی قسم کی دالیں ملا کر پکائی جاتی ہیں- مترجم——

سفر کا شاعرانہ بیان ان دونوں زمانوں میں ایک دوسرے سے کتنا مختلف ہوتا۔ بات یہ ہے کہ الفاظ اور عبارتوں کی طرح سے افکار اور احساسات بھی درجۂ تمدن اور رنگ محیط کے تابع ہوا کرتے ہیں۔ چنانچہ عرب کے اشعار میں ہمیں اونٹ، شراب، کھجور، قبایل کے نام وغیرہ؛ اور عجم کے شعروں میں باغ و بستاں، گل و ریحاں، انگور و سجادہ، سالوس اور مے وغیرہ بڑی تعداد میں نظر آتے ہیں۔ پھر یہ کہ اگر شعر کا رنگ، فطرت کے رنگ کا تابع ہوتا تب بھی ایک بات ہوتی، لیکن قرون وسطیٰ کی ذہنیت کی آمیزش کی وجہ سے مشرق کے شاعرانہ خیالات میں تصنع پیدا ہو گیا، اور اس بے جوڑ پیوند کا نتیجہ یہ ہوا کہ مصنوعی اشعار پیدا ہونے لگے، اور جب ایسے غیر فطری شعر پڑھے جاتے تھے، تو ان کے اثرات بھی غیر فطری اور مصنوعی ہوتے تھے—

ایک جماعت کی تصویریں اکثر اوقات اس کے تصورات کا بھی آئینہ ہوا کرتی ہیں۔ قدیم فارسی کتابوں مثلاً لیلیٰ و مجنوں، سکندر نامہ، شاہ نامہ وغیرہ میں جو بھنگم اور مبالغہ آمیز تصویریں نظر آتی ہیں، وہ در اصل ان اشعار کی اولادیں ہیں جن میں کہ ''ابروے کمان'' ''چشم آہو'' ''زنخدان چاہ'' ''بینی قلم'' اور ''دہان پستہ'' کو ایک ایسے بدن پر سجایا جاتا ہے جو ''برگ گل'' سے بھی نازک تر ہوتا ہے، اور جس کی کمر بال سے بھی زیادہ باریک بتائی جاتی ہے؛ اور اس عجیب الخلقت مخلوق کو اپنا معشوق قرار دیا جاتا ہے! حالانکہ کوئی کہنے والا کہہ گیا ہے کہ:-

آہ ازیں شاعران نادیدہ　　کہ ندارند نور در دیدہ

قد خوباں بہ سرو می مانند　　رخ ایشاں بہ ماہ تابیدہ

ماہ قرصے است نا تمام عیار　　سرو چوبے است نا تراشیدہ

جب میں نے طہران میں ابن بابویہ کے شبیہ گردانوں* ان کے حرکات و سکنات، طور طریقوں، اور باہمی مقابلوں کو دیکھا؛ اور ان کے اشعار سنئے، تو اس وقت فوراً میری سمجھہ میں یہ بات آگئی کہ ہمارے سقا خانوں† میں جو تصویریں نظر آتی ہیں، وہ یقیناً اسی ادبیات کی پیدا کی ہوئی ہیں؛ یا پھر یہ ممکن ہے کہ خود یہ ادبیات ان تصویروں کی آفریدہ ہو - ایک مرتبہ ایک یورپی نے ہمارے ایران کے ایک چینی محل کی دیوار پر فرشتہ کی ایک تصویر دیکھکر مجھہ سے سوال کیا "کہ جو اس کے ہاتھہ ہیں وہی پر بھی ہیں - کیا ایرانی فرشتوں کے ہاتھہ بھی ہوتے ہیں اور پر بھی؟" میں نے جواب دیا کہ اس قسم کے فرشتے اُسی قبیل سے ہیں جو حضرت عیسیٰ کی ولادت کے وقت آسمان سے نازل ہوے تھے؛ اور جن کی تصویریں آپ کے پرانے گرجوں کی دیواروں پر آج تک بنی ہوئی ہیں - ہمارے پاس تو اس عجیب و غریب شکل کے لئے ایک دلیل بھی موجود ہے کہ "الملک یتشکل باشکال مختلفۃ!"—

ان ملائکۂ رحمت کو تو ان کے حال پر چھوڑئے، لیکن اپنے شاعروں کے الہام کے فرشتوں کو کیا کہئے، اور انھیں کیا صورت دیجئے؟ جب ہمارا ہم وطن شاعر یہ شعر کہتا ہے:

اے آفتاب برسر قصر نگار من آہستہ رو کہ پایۂ دیوار ناز کست

تو وہ ہم سے صرف اسی بات کی توقع نہیں رکھتا کہ ہم ایک ایسے قصر کے

---

* شبیہ گرداں = کربلا کے سوانگ کا منتظم - جس طرح ہندوستان میں تعزیے اُٹھائے جاتے ہیں اور علم اور دلدل گشت لگاتے ہیں، اسی طرح ایران میں واقعات کربلا کا سوانگ بھرا جاتا ہے - اسے "شبیہ" کہتے ہیں - اس قسم کی شبیہیں طہران کے جس مقام پر زیادہ دکھائی جاتی ہیں وہ ایک قدیم عالم ابن بابویہ کی قبر کی وجہ سے، ابن بابویہ کہلاتا ہے - مترجم -

† سقا خانہ = سبیل - جہاں پانی کے گھڑے رکھے جاتے ہیں، ہندوستانی سبیلوں کی طرح ایران میں بھی سقا خانے تصویروں سے سجاے جاتے ہیں - مترجم -

وجود کو مان لیں کہ جو اپنی لطافت کی وجہ سے ذرات نور کی سنگینی کا متحمل نہیں ہو سکتا؛ بلکہ ساتھہ ھی ساتھہ ھم سے یہ بھی چاہتا ھے، کہ ھم ایک ایسے معشوق کا بھی تخیل کریں جو اس کیمیا گر کے کاتنے سے بھی زیادہ حساس قصر میں رھتا ھے - فتامل!

اس میں شک نہیں کہ مبالغہ ایک طرح کی صنعت ھے، لیکن نہ اتنا تند مبالغہ! ایک مرتبہ ایک ملا جی ایک حلوائی کی دکان پر گئے، اور اس سے کہنے لگے کہ "کیوں بھائی شیراع (شیرہ) ھے؟" اس نے جواب دیا "حضور ھے تو، لیکن اتنا گاڑھا نہیں ھے (!)

واضح ہو کہ ھمارے اس دعوے کا کہ ادبیات کو فطری اور متناسب ہونا چاھئیے یہ منشاء نہیں ھے کہ اس قسم کے اشعار ھر صنعت سے خالی ہوتے ھیں - ممکن ھے کہ اس بیت میں:

ماہ نو چوں حلقہ در گوش فلک دانی کہ چیست؟
نعل یگران اتابک نصرۃالدین احمد است

صنعت ہو، اور اس سے شاعر کی زیرکی ٹپکتی ہو، لیکن افسوس یہ ھے کہ یہ شعر نہ تو ترجمہ کا متحمل ہو سکتا ھے، اور نہ اس کی تصویر ھی بن سکتی ھے؟ انوری ھمارے مشہور شاعروں میں سے تھا، لیکن جب وہ سلطان وقت کی خدمت میں عرض کرتا ھے کہ:

آسائش جان ز تو ست، جان بے تو مباد
مقصود جہاں توئی، جہان بے تو مباد!

تو ڈر ھے کہ کہیں موجودہ زمانے کی ذھنیت اس کی ھنسی نہ اُڑائے - جس وقت کہ شاہ سلجوقی نے دو چھکوں کی اُمید میں پانسہ پھینکا، اور صرف دو کانے نکلے تو شاعر ازرقی نے کہا:

گر شاہ دو شش خواست دو یک زخم اُفتاد
تا ظن نبری کہ کعبتین داد نداد؛
آں زخم کہ کرد رائے شاہنشہ یاد
در خدمت شاہ روے بر خاک نہاد

اس میں شک نہیں کہ اس نے ایک بات پیدا کی، اور بدیع گوئی کی، لیکن ساتھہ ھی بد قسمتی سے مشرق کے دوسرے بیانات کی طرح، اس کا یہ تصور بھی باطل، اور یہ بیان جھوٹ تھا۔ قصہ مشہور ھے کہ ایک مرتبہ شاہ مرحوم (ناصرالدین شاہ قاچار) نے کسی سفیر سے کہا "راستی ھندوستان مال شماست" تو سفیر نے اس کے جواب میں عرض کیا کہ "نذر ھے" مشرق کے یہ چڑھاوے اور ھدیے اور بیانات اکثر صنعت مبالغہ رکھتے ھیں۔ افسوس کہ اس قدر مبالغے کے بعد بھی ھم ابھی تک بالغ نہیں ھوے!

اگر صرف یہی ایک خرابی ھوتی، تو بھی کچھہ ایسی بات نہ تھی، لیکن بد قسمتی سے مبالغہ نے تملق اور خوشامد کی راہ دکھائی، اور اس صنعت نے ھماری ادبیات کے بہترین ٹکڑوں کو بت پرستی کے داغ سے ملوث کر دیا۔ کوئی قاتل سے قاتل، اور غدار سے غدار بادشاہ بھی ایسا گزرا ھے جسے کسی نہ کسی "امیرالشعراے زمان" نے "اعدل ناس" نہ بتایا ھو۔ کیا انوری اور منوچہری کے بہترین قصیدوں کی تان آخر میں سلاطین اور امرا کی تعریف پر نہیں ٹوٹتی؟۔ اگر ھم ان فارسی دیوانوں کو جو قوی دستریں اور فلاں بن فلاں کی مدح (یا پھر ھجو) میں لکھے گئے ھیں، اپنی ادبیات سے نکال لیں، تو اس میں کتنے شاعر اور کے دیوان باقی رہ جائیں؟ ھمارے یہاں ایسے کتنے شاعر گزرے ھیں جو عطار کی طرح یہ دعویٰ کرسکیں کہ:

بعمر خویش مدح کس نہ گفتم؟

اس داغ کو دور کرنے کے لئے سواے اس کے اور کیا کہا جا سکتا ھے کہ ایران

انسانوں کا گھر نہیں بلکہ خاص خاص اشخاص کی مملکت رہا ہے ؛ اس کے تمام کام ہمیشہ جمہور کی نہیں بلکہ صرف چند افراد کی رغبت ، ارادے ، ہوسنا کی اور تشدد کی خاطر ہوا کئے ہیں ، اور اسی وجہ سے اس کی ادبیات بھی اشخاص ہی کی مدح و قدح کا صحیفہ ہے نہ کہ ملت کا ؟ اور اگر ہم نے اسے تسلیم کرلیا ، تو گویا قدرتی طور پر یہ بھی تسلیم کر لیا کہ اپنے الفاظ کی طرح سے ، ہماری ادبیات کی روح بھی ویسی ہی رہی ہے جیسی کہ گزشتہ عصروں ، اور طوائف الملوکی کے دوروں میں خاص طور پر ہونی چاہئے تھی —

فردوسی کو کون نہیں جانتا ۔ اس نے ایران کو زندہ کیا ، اس کا درجہ بہت ارفع و اعلیٰ ہے ، وہ ہماری حیات ملی کا حامی ہے ، لیکن اسی فردوسی کے متعلق اگر ہم یہ کہیں کہ یوسف و زلیخا ، میں اس نے اپنے کئے ہوے کام پر ندامت کا اظہار کیا ، تو امید ہے کہ ہمارے اس بیان کو کفر نہ سمجھا جاے گا ۔ کہتا ہے : —

بریں می سزد گربخندد خرد زمن این جنوں کے پسندد خرد
کہ یک نیمہ از عمر خود کم کنم جہانے پر از نام رستم کنم (!!!)

کیا یہ کہنا کچھ گناہ ہے کہ ہمارے قومی شاعر نے اپنی ایک عمر کی زحمت ، اور ایک لاقیمت تصنیف کو محض اس وجہ سے فضول اور بے کار سمجھ لیا کہ وہ سلطان غزنوی کی عطوفت حاصل نہ کرسکا ، اور اس کے مذہبی خیالات کا ساتھ نہ دے سکا ؟ محض شاہ غزنوی کی نا قدری کی وجہ سے اپنے منصب بزرگ سے دست بردار ہو جانا ، اور اپنی مشہور تصنیف کی قیمت صرف چند درہم و دینار سمجھنا : یہ طوس کے شاعر کے بلند رتبہ کے ہرگز شایاں شاں نہ تھا —

اگر صرف بھتئی کرنا ہی ہماری ادبیات کا بڑا نقص ہوتا تو بھی اس سے یہ کہکر چشم پوشی کی جاسکتی کہ اس وقت زمانے کا اقتضاء یہی تھا ۔ لیکن مدح وغیرہ میں جو کچھ مبالغہ کیا گیا ، اس کی وجہ سے ہماری ادبیات میں غیر فطری اور بے تناسب تصویریں بھی پیدا ہوگئیں ، اور انھوں نے آدمیوں کی

پرواز فکر کو صرف ایک سراسر خیالی اور بے تناسب دنیا کا پابند اور مقید بنا دیا - جھوٹ ، عجیب و غریب تصویریں ، غلط اور بے جوڑ رنگ : ان سب نے حالات موجودہ کے مقتضا کو تو بھلادیا ، اور ایک ایسا خیال خانہ بنانے پر مجبور ھوگئے کہ جس کے رھنے والے سرو ، بلور ، نقرۂ خام ، اور یا قوت کے بنے ھوے ھیں ، اور ان کی آنکھیں ھر نون کی جیسی ، اور ان کی زلفیں سانپوں کی طرح کی ھیں ! اس قسم کے تصورات نے محیط کو مصنوعی بنا دیا ، اور محیط نے ان تصورات کو اور زیادہ مصنوعی کر دیا ، اور اس طرح دین کی سر حد سے لیکر عشق کی حد تک جتنا بھی قومی اخلاق کا مجموعہ تھا سب نقلی اور مصنوعی بن کر رہ گیا —

اس قسم کی باتوں کا ایک لازمی نتیجہ یہ ھوا کہ غیر فطری عشق کا سمّی اور قاتل اثر بڑھنا شروع ھوا ، اور رفتہ رفتہ وہ ایران کے رگ وریشے میں سرایت کر گیا : یعنی آدمیوں کی عاشقانہ حس اپنے فطری راستے سے الگ ھوگئی اور ایک دوسرا راستہ اختیار کر لیا ...... ! ان بادشاھوں تک نے جو عوام الناس کی زندگی کے مالک تھے علانیہ امرد نوازی سے پرھیز نہ کیا ، اور درباری شعرا نے یہی مذموم اخلاق اپنے اشعار میں بیان کئے اور ھمیشہ اخلاق کش " ایازوں " کے ھاتھہ سے بھروا کر شراب کے پیالے اُڑاتے رھے !

ایک مرتبہ میرے سامنے ایک مشہور بزرگ اپنی قوم کی اس بد اخلاقی کے عذر کے طور پر یہ کہنے لگے کہ یہی حرکت قبیحہ بعض مغربی ممالک میں بھی پائی جاتی ھے - میں نے جواب دیا کہ اگر یہ چیز کہیں باھر موجود ھے بھی ، تو اول تو اتنی زیادہ نہیں ھے ، جتنی یہاں - دوسری بات یہ ھے کہ مشرق کی طرح سے اسے وھاں تربیت شباب کا جز نہیں بنایا جاتا ، اور تیسری بات یہ ھے کہ ملت ایران ، یا بعض اور پڑوسی قوموں کے علاوہ کوئی اور قوم اس معاشرتی مرض کو ، جو عورتوں کی جہالت اور اسیری سے بھی کہیں زیادہ بد تر ھے ، اپنی ادبیات

میں اتنی اهمیت دیتی جتنی که هم دیتے هیں - همارے یہاں کے شاعروں نے تو اس معاشرتی مرض پر ایک خاص ادب پیدا کر دیا هے ' اور ایک ایسی جنت تیار کر دی هے که جس میں " حور " کا تو کہیں نام تک نہیں هے البتہ جہاں تک نظر کام کرتی هے " غلمان هی غلمان " نظر آتے هیں —

یاد رکھئے که خوشامدانه ادبیات ' سفارشی ادبیات ' زشت ادبیات ' غیر فطري ادبیات —— یه سب بدل کر رهیگی —

پرانی ادبیات کے وہ وکیل جو اس کے دھبوں کو اقضاے زمان کا عذر کر کے دھونا چاهتے هیں ' کسی قدر حق پر هیں - هم بھی ان معاشرتی آلائشوں کی ذمه داري اسی محیط پر عاید کرتے هیں : یعنی اس شخص پرور اور مادی محیط پر ' اس محیط پر جو یه چاهتا تھا که همارے بزرگوں کی عقل و دانش کے قیمتی جوهروں کو درهم ودینار کے عوض خرید لے ' اور ان کے اُبلتے هوے افکار کو ارباب دول کا طفیلی اور حاشیه نشین کر دے ' اور شاعر کو ' آبدار خانۂ همایونی ' کاجز بنا ڈالے ' تا که جب کبھی سلطانی خاصه خاطر اقدس کو پسند آیا کرے ' یا تیر هدف نشین هو ' یا اسپ شاهی کوئی اچھا کارنامه دکھاے ' تو مناسب حال شعر کہے جائیں ' اور ابنیاء اور اولیا کے دلایل اور شہادتیں اس طرح نقل کی جائیں گویا که روز قیامت کا آنا ثابت کیا جا رها هے - بے شک ان خرابیوں کا ذمه دار محیط هی هے - ورنه جو فکر که ماه نو تراش کر گھوڑے کا نعل بناسکتی هے ' اگر وہ آزاد هوتی تو کیا کچھه نه کر دکھاتی - چنانچه ان معنوي کوتاهیوں کے با وجود بھی ' اسی محیط میں ایسے ایسے لوگ پیدا هو چکے هیں جنھوں نے اپنے شعله افکار سے آسمان ادب پر اجالا کر دیا هے ' اور اس طرح دنیا کو جتا دیا هے که ابھی هم جیسے لوگ باقی هیں - همارے خیام اور سعدی سے آج مغرب کا هر تعلیم یافته نوجوان جتناواقف هے شاید هم لانگ فیلو (Longfellow) اور فتز جرالڈ (Fitzgerald) سے اتنے واقف نہیں هیں' اور بہت سے انگریز اور امریکی نوجوانوں کو تو

رباعیات خیام زبانی یاد ھیں - حافظ کی غزلیں، ناصر خسرو کے قصاید، فردوسی کا شاہ نامہ، مولانا جامی و مولوی روم کے جیسے شعراے متصوفین کی تصنیفات وغیرہ: یہ سب علم اور ادب کے خزانے ھیں؛ یہ دنیا کی بڑی بڑی یادگاروں میں سے ھیں، اور ھر ملت اور ھر زبان کے لئے قابل فخر ھیں - یہ لوگ علم اور ادب کے بین الاقوامی پہلوان تھے۔ تاریخ انسانی نے ان کے سروں پر تاج افتخار رکھا، اور اُنھیں زندۂ جاوید بنا دیا ھے —

لیکن یہاں ھم اقتضاے وقت کے سوال سے بحث کر رھے ھیں - ھمارے قدیم شاعروں کا اپنے فن میں بڑا مرتبہ حاصل کرنا ھمیں اس کا مجاز نہیں بناتا کہ ھم ھمیشہ انھی کے جیسے شعر کہا کریں، اور سواے ان کے طے کئے ھوے راستے کے، کسی اور راستہ میں قدم نہ رکھیں - جس اقتضاے وقت نے اُنھیں اس بات پر مجبور کیا تھا کہ وہ ایک خاص طرز کے شعر کہا کریں، اُسی کا تقاضا ھم سے یہ چاھتا ھے کہ ھم سخن گوئی کے نئے اصول استعمال کریں —

ایک دن میرے ایک دوست نے جن کا عقیدہ یہ تھا کہ سواے زبان کے اور ھر چیز میں یورپی طرز اختیار کرنا چاھئے، نہایت اطمینان اور یقین کے ساتھ مجھ سے کہا "دوسرے جس موقع پر "ڈیر سر" یا "موسیو" کہتے ھیں، ھم اس موقع پر "فدایت شوم" کہتے ھیں - ھر زبان کا طریقہ الگ ھوتا ھے - مثلاً ڈیر سر کے ترجمے کے طور پر اگر فارسی میں "آقاے عزیز" لکھا جاے تو کچھ اچھا نہ معلوم ھوگا" فی الحقیقت اس حد تک میرے فاضل دوست کی راے نہایت صائب تھی - میں نے جواب دیا "فدایت شوم" کی حد تک تو خیر غنیمت ھے، لیکن "تصدقت شوم" کو کیا کہا جاے، اور "قربان خاکپاے جواھر آسا" کو کہاں لکھا جاے؟" کیا اگلے لوگوں کی اصطلاحیں اور اُن کا روز مرہ ھمارے لئے بھی اٹل دستورالعمل کا حکم رکھتا ھے؟ اس قسم کی عبارتیں "قربان خاکپاے جواھر آسا" وغیرہ اُس وقت رائج تھیں، لیکن یہ فی الحقیقت اس زمانے کی قومی روح

کا پتہ دیتی ھیں، جو سرے سے مفقود ھی تھی- اس قسم کی عبارتیں ایک مقید، غیر مستقل، عاجز اور بے بس محیط کی خصوصیتیں ھیں، لیکن ایک نئی اور جوان قوم کے لئے نئی اور جوان عبارتوں اور اشعار کی ضرورت ھے؛ اس لئے کہ نئے معنی اور نئی روح کی تعبیریں بھی نئی ھونی چاھئیں- ابوالمعالی کا مقدمۂ کلیلۂ و دمنہ بے شبہ بہت خوب لکھا ھوا ھے، اور اس نے بادشاہ کے القاب میں کوئی کوتاھی نہیں کی ھے؛ لیکن جدید انشا پردازی اس قسم کے طرز کلام کو اور وہ بھی حاکموں کی تعریف میں، ھرگز اپنا شیوہ نہیں بنا سکتی- اس لئے کہ نئی فکر نیا اسلوب بھی چاھتی ھے- اگر کسی مجبوری کی وجہ سے شاھان سلف "رحمہم اللہ" کے زمانے کی آلودہ عبارتیں آج باقی رھیں، تو اس کے ساتھ یہ بھی لازم ھے کہ اس زمانے کے معانی اور احساسات بھی نئے سر سے زندہ ھو جائیں، اور آزادی اور حریت کے پچھلے سولہ سالوں میں جو کچھ اشعار اور مقالات لکھے گئے ھیں، وہ محو اور منسوخ قرار دئے جائیں؛ اور لوگوں کو پھر اس کی اجازت دی جائے کہ باب فعال اور تفعلل استعمال کرنے لگیں، اور بحر تقارب کا تقرب حاصل کریں..............

میرے محترم دوست اس بارے میں اتنے انتہا پسند تھے کہ جو ضروری جدید اصطلاحیں ترکی، مصر وغیرہ جیسے اسلامی ملکوں میں آج کل رائج ھیں، انھیں ان کے قبول کرنے سے بھی انکار تھا، حتی کہ وہ "تشبث"* کی بجائے "ھمت"؛ اشغال نظامی† کی جگہ "تصرف"؛ ژاندارم‡ کے بدلے "قرانسوران"؛ ممالک متحدہ

---

* اس لفظ کے لغوی معنی ھاتھ مارنا ھیں، جیسے کوئی ڈوبتا ھوا شخص کسی چیز کو پکڑنے کے لئے ھاتھ مارے- مترجم—

† اشغال نظامی سے مراد فوجی نقل و حرکت ھے—

‡ یہ ایک فرانسیسی لفظ Gendarme ھے- ترک اسے جلدرمہ کہتے ھیں، فارسی میں لفظ ژاندارم بڑے عرصہ سے مستعمل ھے—

یا امریکہ کی جگہ "ینگی دنیا"؛ اور سب سے زیادہ عجیب بات یہ کہ "کودتا" کا مفہوم ظاہر کرنے کے لئے' جیسے عثمانی 'حکومت کی سختی' کے معنوں میں استعمال کرتے ھیں "حرکت عنیف حکومت" کہتے تھے! یہی حال دوسرے الفاظ کا بھی تھا—

کسی زمانے میں جب دو لڑنے والے ایک دوسرے کے مقابل کھڑے ہوتے تھے تو یوں للکارتے تھے "نام تو چیست' تن بے سرت را کہ خواھد گریست؟" آج کل "التی میٹم" دیتے ھیں - اسی طرح سے تیر' سپر اور کمان کی جگہ مشین گن* اور طیارن† کا استعمال کرتے ھیں' اور آبدوز کشتی‡ سے بھی کام لیتے ھیں - اگرچہ فردوسی علیہ الرحمہ نے جنگ و پیکار کے متعلق ھزاروں ھی اشعار کہے ھیں' لیکن جب نئی ایجادوں اور نئے معانی سے کام پڑتا ھے' تو ان کے لئے نئے جملوں اور عبارتوں کی بھی ضرورت ھوتی ھے—

اس صراحت کی تو شاید کوئی ضرورت نہیں ھے کہ مذکورۂ بالا بحث سے ھمارا یہ مطلب ھرگز نہیں ھے کہ اگلے لوگوں کی ساری عبارتیں مٹا دی جائیں؛ پرانی ادبیات کو بالکل فراموش کر دیا جاے؛ یا پرانے انشا پردازوں کے اسلوب بیان اور انشاء کو سرے ھی سے غائب کر دیا جاے - دنیا کی کسی تعلیم اور دستور کو یک رخی بن کر نہ دیکھنا چاھئے' کیونکہ اس میں غلط فہمی کا اندیشہ رھتا ھے - مستعمل اور غیر مستعمل فارسی لغات کا جو بڑا ذخیرہ پہلے سے چلا آرھا ھے' وہ تو خیر ھے ھی' لیکن اس کے علاوہ فارسی زبان میں ایک طرح کا فطری حسن بھی پایا جاتا ھے اور وہ یقیناً اس قابل ھے کہ ھمیشہ ھمیشہ باقی رھے—

---

* اسے ایرانی میں "شصت تیر" کہتے ھیں—

† اس کے لئے فارسی لفظ ھوا پیما استعمال کیا گیا ھے— مترجم

‡ ایرانی اس کو "زیر دریائی" کہتے ھیں جو Submarine کا لفظی ترجمہ ضرور ھے' لیکن آبدوز کی خوبصورتی کو نہیں پہونچتا - مترجم—

ایرانی ادبیات میں ایک خاص کشش اور جادو ھے ' اور وہ مقامی میووں اور پھلوں ' یا ساروق کے قالینوں' ھاتھی دانت کے صندوقوں' یزد کی شالوں' اور اصفہان کے قلمکاروں* کی طرح اس سر زمین کے لئے ایک مخصوص لطف رکھتی ھے۔ شرقی ایرانی زبان کے بعض لب و لہجے ادبیات میں "گلزار سامان" پرندوں اور بلبلوں کی حیثیت رکھتے ھیں' اور اس قابل ھیں' کہ انھیں محفوظ رکھا جائے۔ ھمارے شاعر کا یہ شعر

مزرع سبز فلک دیدم و داس مہ نو
یادم از کشتہ خویش آمد و ھنگام درو

ایک ایسی لطیف مشرقی تصویر پیش کرتا ھے' جس میں ھاتھی دانت کے صندوق اور اس کی ریزہ کاری کا لطف آتا ھے' اور اسے مقافا نامکمن ھوجاتا ھے۔ اسی طرح سے اُسی شاعر کا یہ شعر :

صبحدم مرغ چمن باگل نو خاستہ گفت
ناز کم کن کہ دریں باغ بسے چوں تو شگفت ....الخ

نہ صرف مشرق کے سوز و گداز میں ڈوبے ھوے احساسات کے تار کو چھیڑتا ھے' بلکہ مغربی ذوق پر بھی کسی قدر پورا اُترتا ھے' اور وکٹر ھیوگو (Victor Hugo) کے "پروانۂ وگل" والے شعر کی یاد دلاتا ھے؛ اس لئے کہ اس میں بھی گل و پروانہ اسی طرح کا راز و نیاز کرتے ھیں۔ اس قسم کے اشعار عطر بیز پھولوں کا حکم رکھتے ھیں' کہ جہاں کہیں بھی ھوں قوت شامہ اُن سے محظوظ ھوتی ھے —

ذرا دیکھئے! ایک اور شاعر اپنی مرحومہ محبوبہ کی یاد میں کیا سحر حلال کرتا ھے' کہتا ھے :

ھنگام بہار است و گل و لالۂ و نسریں
از خاک در آیند تو در خاک چرائی

---

* قلمکار ایک قسم کا بیل بوٹوں دار کپڑا ھوتا ھے "چھینٹ" مترجم —

چوں ابر بہاری بروم زار بگریم
چنداں سر قبر تو کہ از خاک درآئی!

مجھے یقین ہے کہ جب تک دل کا وجود ہے، اور دنیا قائم ہے، اس قسم کے شعروں کی تاثیر اور گرمی ہرگز ہرگز کم نہیں ہوسکتی - ایسے اشعار نہیں بلکہ ایک ملت کی معنویات کے نقش و نگار ہیں، جو سدا بہار پھولوں کی طرح کبھی مرور زمانہ سے ہرگز متاثر نہیں ہوسکتے- خیام کا شعر ہے: —

صبح است و ببیں ہوا نہ گرم است و نہ سرد
ابر از رخ گلزار ہمی شوید گرد

اس کے دوسرے مصرعے میں لفظوں کی لطافت، اور معنوں کے سوز و گداز کا ایسا جادو بھرا ہوا ہے کہ زمین و زماں اس "بیت جواں" کو کوئی صدمہ نہیں پہونچا سکتے - اس قسم کے ادبی اور ادبی لطائف جس قوم میں بھی ہوں، ہمیشہ اس کی امتیازی صفت بنے رہے ہیں، اور ہمیشہ رہینگے - ان کو زوال نہیں ہے: جیسے ابوالعلیٰ کے قصیدے یا ابوالعتاہیہ کے مرثیے اور غرامیات (عشقیہ نظمیں) عرب سے کبھی مٹ نہیں سکتے- یہ سب کچھ ہے، لیکن پھر بھی یہ شاعرانہ ملاحظات اپنے نپے تلے کلموں سے نئی حسیات اور جدید علوم و صنائع کے بہاؤ کو نہیں روک سکتے- جس صورت میں کہ دنیا کی زندہ زبانیں ہر سال اپنی لغت میں ہزاروں نئے الفاظ بڑھا رہی ہیں، شمس قیس، یا عروضی سمرقندی، یا شیخ عطار کے زمانے کی فارسی ہماری آج کل کی علمی اور ادبی ضرورتوں کے لئے کافی نہیں ہوسکتی - چنانچہ اگر ان الفاظ پر جو اسی مشروطہ کے چند سالوں میں بنے ہیں جیسے خود لفظ" مشروطہ " ہی، "قانون اساسی *" "عدلیہ+" اور پھر جدید فوجی اصطلاحوں

---

* قانون اساسی = دستور، (Constitution)
+ عدلیہ = ہائی کورٹ یا عدالت العالیہ

پر غور کیا جاے تو معلوم ہوتا ھے کہ تجدد یا ترقی جب ایک مرتبہ شروع ھو جاے تو پھر قدرتی طور پر ھمیشہ جاری رھتی ھے - لیکن چوں کہ ھر انقلاب اور تجدد میں افراط پیدا ھو جایا کرتا ھے' اس لئے مذکورۂ بالا باب میں بھی (جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ھے) افراط سے پرھیز واجب ھے - فارسی زبان کی سلاست کو نامناسب اور بیگانہ الفاظ کے خلط سے' یعنی فوری اور بے سمجھی بوجھی آمیزش سے غارت نہ کر دینا چاھئے: اور یہ سمجھہ لینا چاھئے کہ جس طرح ھماری زبان اور ادبیات اپنی ایک الگ خصوصیت اور قومی حیثیت رکھتی ھے' اسی طرح غیر زبانیں بھی رکھتی ھیں' اور ھمارا یہ مطلب ھرگز نہیں ھے کہ ایسی مغربی ادبیات فارسی میں لی جاے جس سے ھماری زبان کی اساس یا اُس کے معنے ھی ھاتھہ سے جاتے رھیں - اس کو ایک مثال کے ذریعے یوں سمجھئے کہ ھم آج کل اس امر پر مجبور ھیں کہ اپنے خور و خواب کے طریقے بدلیں' اور چھری کانٹے* سے کھایا کریں' لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ھم خوک یا مینڈک یا گھوڑے یا سرطان کا گوشت بھی کھایا کریں - اسی طرح سے ادبیات میں بھی یہ ممکن ھے کہ ھم اپنے ھم عصر اھل قلم افراد کے نئے طرز بیان' ان کے فائدہ بخش اصول' اور رومانی اسلوب بیاں کو اپنی زبان میں لے لیں' لیکن یہ کچھہ ضروری نہیں ھے کہ ھم اپنی تحریروں میں بھی فرنگی بن جائیں- دنیا میں جتنی قومیں ھیں' ان سب کے اپنے اپنے مخصوص اور مقامی بیانات اور احساسات ھوتے ھیں - مثلاً جو اشعار یا نثریں انھوں نے عید میلاد (کرسمس) ' یا فتح الساس اوریں یا شاہ شارلماں کے زمانے کے معجزوں وغیرہ کے متعلق لکھی ھیں' وہ اتنی ھی فرنگی الاصل ھیں جتنی کہ ھمارے نو روز نامے' مرثئے یا کلیلہ کی حکایتیں'

---

* " کارد و چنگال "

ایرانی الاصل هیں - مثلاً اگر کوئی یہ لکھے :— " اے دیوارالساس"* تو دی شب در صحراے فکور حسیات بایر من حایلے سہمگین بودے - خیلات خام من گا ہے با تو می جنگیدو گاہے تورا آغوش می کشید - دریک نظر گوئی شیمۂ غولانی را کہ دراطرات تو اند بر خود گرفتۂ ۔ دیروز نو را عبوس دیدم ' امروز شکستۂ عید میلاد است ' ولے تو در خندہ ات تصرت کن کہ ' ایفل ' از دور چشم تنقید بر افق تو دوختہ و از تو وفا می جوید...........الخ" ظاہر ہے کہ اس جملے کے احساسات کی بعض خصوصیتیں اور حیثیتیں خالص فرنگی ہیں اور ایرانیوں کے احساسات کے لئے بالکل بے گانہ ہیں' ہمارا خیال ہے کہ شاید پاے تخت ایران کے اکثر آدمی تو اس جملے کے طرز خیال اور اس کے جغرافیہ کے سمجھنے سے بالکل ہی قاصر رہیں گے —

پس ہمارا مطلب یہ نہیں ہے کہ زبان فارسی کا تجدد اِس قدر جلد بازی کے ساتھ ' فوری' تقلیدی اور بے گانہ منش ہونا چاہیے - اتنا بہر حال تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ہمارے زمانے کے تمدن کے ساتھ ساتھ فنون لطیفہ کے بین الاقوامی شعبوں میں بھی ترقی اور کمال ظاہر ہوے ہیں - اگر آج کل کے زمانے کا کوئی مصور اپنے مو قلم کی ایک جنبش سے' رنگ آمیزی کر کے' عشق کے پر سوز و گداز حسیات کی بولتی ہوئی تصویر بناے' تو اُس کا یہ کمال کسی وطن یا ملت کے ساتھ مخصوص نہیں ہے' بلکہ فی الحقیقت کل بنی نوع انسان کے مصفا احساسات کا نمونہ کہا جاے گا - ادبیات کے لفظوں اور معنوں میں بھی اس قسم کی (بین الاقوامی) جنبش قلم اور جلوے نظر آسکتے ہیں - اگر میرا حافظہ غلطی نہیں

---

* یہ ایک فرانسیسی عبارت کی طرح کی فارسی عبارت ہے - ظاہر ہے کہ "صحراے فکور حسیات بایر" (ویران احساسات کی فکروں کا صحرا) یا " در خندہ‌ات تصرف کن" (ذرا کم کم ہنسو) ' یا کسی جگہ کے لئے یہ کہنا " دیروز تورا عبوس یافتم " مشرقی عبارت اور طرز خیال کے لئے کس قدر خیال ناموزوں ہے (مترجم)

کرتا، تو مجھے خیال پڑتا ہے کہ میں نے ایک مرتبہ ایک مشہور روسی مصور کی بنائی ہوئی تصویر دیکھی تھی - اس نے ایک حسین اور دل کش لڑکی کی تصویر تین طرح سے بنائی تھی - یعنی اگرچہ ان تینوں تصویروں میں رہی ایک صورت اور حسن کا وہی جادو ظاہر کیا گیا تھا لیکن اپنے مو قلم کی ایک ہلکی سی جنبش سے اس نے ان تینوں تصویروں کی آنکھوں کے انداز میں ایک غیر محسوس فرق پیدا کر دیا تھا اور در اصل آنکھیں ہی قلب کا آئینہ ہوا کرتی ہیں - تینوں تصویروں کی آنکھیں آسمان کی طرف اُٹھی ہوئی تھیں، لیکن قلم کی قوت اور تصویر کی قدرت ملاحظہ ہو کہ ہر تصویر میں ایک نئے معنے پیدا ہو گئے تھے، اور ایک کے نیچے لفظ "عشق" دوسری کے نیچے "ایمان" اور تیسری کے نیچے "اُمید" لکھا ہوا تھا - یہ نہ سمجھئے کہ ان تصویروں میں یہ روحانی کیفیات صرف اِن سرخیوں کو پڑھنے کے بعد ہی محسوس ہوتے - نہیں! اگر آپ ان دو سادہ اور جادو بھری آنکھوں پر ایک گہری نظر بھی ڈالئے، تو آپ کو فوراً یہ تین کرشمے الگ الگ محسوس ہونے لگتے —

فنون لطیفہ میں سے ہر ایک میں آج بھی بین‌الاقوامی خصوصیت نظر آتی ہے - خاص کر موسیقی میں تو اس کی نمایاں مثالیں موجود ہیں - لیکن موسیقی کی کچھ قومی حیثیتیں بھی ہوا کرتی ہیں - بعض عام گیت، قدیم فرنگی دھنیں* حتیٰ کہ واگنر (Wagner) شوپن (Schopen) اور انھیں کی طرح بعض بڑے اُستادان موسیقی کی اکثر چیزیں اتنی ہی یوروپی الاصل ہیں جتنے کہ نغمۂ تار ایرانی، اور نالۂ نی ٹھیٹ ہندی چیزیں ہیں - لیکن اِس کے ساتھ ہی ساتھ، آپیرا†، اور بعض گیت جن میں بغض، کدورت، یاس، وجد، شغف، عشق، تنہائی

---

* اس کے لیے فارسی لفظ "ہوا ہا" (ہوا کی جمع) ہے جو انگریزی 'airs' کا لفظی ترجمہ ہے —

† ایک قسم کا منظوم ڈراما ہے جو موسیقی کی دھنوں میں گایا جاتا ہے —

وغیرہ کے احساسات دکھاے جاتے ھیں اس قدر فطری انداز میں لکھے گئے ھیں کہ وہ مقامی اور مخصوص ھونے کی بجاے' انسانوں کے مشترک احساسات پر حاوی ھیں' اور اِس وجہ سے بین الاقوامی حیثیت رکھتے ھیں۔ جب ایک فن موسیقی کا اُستاد گیت کے کسی ٹکڑے میں چاندنی راتوں کے سکون' بلبل کی دلکش صدا' کسی چھوٹے سے جھرنے کے گرنے کی ھلکی اور نرم آواز' باد بہاری کے آھستہ اور رک رک کر چلنے کو مجسم بناکر دکھا دیتا ھے؛ اور کوئی ھوشیار اُستاد اسی کو نغمۂ موسیقی میں گویا بناکر پیش کرتا ھے' اور اس طرح ھمیں حیرت زدہ بنا کر' موسیقی کے پیدا کئے ھوے ایک دوسرے ھی عالم کے جلووں میں محو کر دیتا ھے'۔ تو اس کا یہ کرشمہ نہ قومی ھوتا ھے' اور نہ مقامی: بلکہ ھمیشہ بین الاقوامی حیثیت رکھتا ھے' اور اس میں ھر پر سوز و گداز دل کو ایک خاص لطف حاصل ھوتا ھے۔ جب وہ مشہور و معروف گیت جس کا نام "ماسکو کی آتش زدگی" ھے' جو مشہور زمانہ روسی موسیقی داں چایکو وسکی کی تصنیف ھے' اور جس میں نپولین کی فوجوں کی مار دھاڑ' ناقوس کی صدا' آدمیوں کی دھشت' آگ کی لپٹ وغیرہ کو مجسم بنا کر دکھایا گیا ھے —— جب یہ گیت پیانو کے میٹھے پردوں میں سنا جاتا ھے' تو سننے والے کے احساسات کے سامنے موسیقی کی عبارت میں ایک تاریخی واقعہ آجا تا ھے: گویا کہ انسان خود اپنے کانوں سے یہ صدا سنتا ھے: "جرس فریاد می دارد کہ بر بندید محملہا"؛ اور شہر ماسکو کی لوٹ کھسوٹ' مار دھاڑ اور دار و گیر کا سماں اس کی آنکھوں کے سامنے آجا تا ھے۔ حقیقت یہ ھے کہ چایکو وسکی نے ماسکو کی آتش زدگی والے گیت کو موسیقی میں اسی خوبی سے ادا کیا ھے' جیسے وکٹر ھیوگو نے قلم سے کیا ھے۔ اسی طرح سے جب کوئی شخص حضرت عیسیٰ کی گرفتاری' مظلومیت اور قتل کے حالات کو جو انجیل میں درج ھیں مشہور فرانسیسی ماھر موسیقی شارل دبوا' کے 'آپرا' میں سنتا ھے تو اسے معلوم ھوتا ھے کہ زندگی کی کلفتوں اور مسرتوں کی تصویر کھینچنے

میں فنون لطیفه نے کیا ترقی کی ھے - اس قسم کی چیزیں' جو مقامی اور قومی خصوصیتوں کی بجائے' علمی اور فطری لذتوں' اور جمہوری اور بین الاقوامی لطائف کی حامل ہوتی ھیں' ھمارے مقصد کو بخوبی واضح کرتی ھیں- ان سے معلوم ھوتا ھے کہ شعر' موسیقی' مصوری' سنگتراشی وغیرہ حیات انسانی کے واقعات کے حسی پہلوؤں کی تصویر کس خوبصورتی سے بناتے ھیں' اور اس میں ایسے بہترین طریقے استعمال کرتے ھیں جو واردات قلبی کے لئے عین موزوں' اور مبالغہ اور تصنع سے پاک ہوں--

ہم پھر کہتے ھیں کہ فارسی زبان کو چاھئے کہ عصر حاضر کی ذھنیت اور روح سے استفادہ کرے' اور مشرق اور مغرب میں جو آمیزش ممکن ہو سکتی ھے' اتنی ھی خود بھی کرے - اب یہ فرض فارسی زبان جاننے والوں کا ھے کہ وہ عصر حاضر کی روح سے واقف ھوں' ورنہ محض زبان تو ظاہر ھے کہ ایک بے جان چیز ھوا کرتی ھے- اگر بفرض محال ہم خود یہ آمیزش نہ کریں' تو بھی یہ ہو کر رھے گی؛ اس لئے کہ ارتقا کا عمل' تو فطری طور پر ہو کر رہتا ھے - مختصر یہ کہ جس قدر بے جا تعصب سے کم کام لیا جائے گا' اور جوانان ملک سوچ سمجھ کر نئی چیزوں کو اختیار کریں گے' اتنا ھی (ھماری زبان میں) کم خلل واقع ہو گا - ہم نے یہ الفاظ ''سوچ سمجھ کر'' اس وجہ سے استعمال کئے کہ نری تقلید میں جو خطرہ ھے وہ معلوم ہو جائے اور اُس سے احتراز کیا جائے ورنہ وھی مثل ہو گی ''من تشبه بقوم فهو منهم''--

ادھر ھماری ادبیات نے اس منزل میں قدم رکھا' اور ادھر اس کی آنکھوں کے سامنے ایک دوسری ھی دنیا ھو گی' اور وہ تھوڑی ھی سی مدت میں مطرب و مغبچه' گبر و ترسا' سجادہ و سالوس کو چھوڑ کر عشق فطری کے شعبوں' معاشرتی عادات اور قومی میلانات کی طرف متوجه ھوجائے گی' اور اس کے معاشرتی موضوعات روحی عنصر سے خالی نہ رھیں گے-

اس میدان میں نئے موضوعوں کی کوئی کمی نہیں ہے - اگر ایران کا عالم نسوانی ایک نئی زندگی پالے' تو اکیلا وہی معاشرتی ادبیات کے سلسلے کے لئے ایک سر چشمۂ الہام کا کام دے سکتا ہے - عورتوں کی بے بسی اور نادانی؛ ازدواجی تعلقات کی المناک صورتیں جو مشرق میں بہت عام ہیں؛ نا کام محبتیں ؛ مظلوموں کی آہیں؛ نکاحوں اور طلاقوں کے واقعات —— غرض کہ کیا کچھہ نئی باتیں اس قوم کے تاریخی کارناموں میں نہیں بڑھائی جا سکتیں - ایران نو کی روح کو زندہ رکھنے' اس کے خونیں انقلاب کی معنویتوں کا پتہ دینے' اور یاد رفتگاں کو تازہ رکھنے کے لئے کیسی کیسی لطیف ادبی چیزیں شائع کی جا سکتی ہیں؟ اس سر زمین کے معاشرتی اخلاق کی درستی کے لئے کیسی کیسی کتابیں اور ناولیں لکھی جا سکتی ہیں؟ ماضی اور حال کی باتیں بتانے' اور مستقبل کی منزل مقصود کی طرف اشارہ کرنے کے لئے کیسے کیسے ناٹک لکھے جا سکتے ہیں؟ تمام اقوام عالم کی بڑی بڑی تصنیفوں کے کیسے کیسے مفید ترجمے ہو سکتے ہیں؟ —

ایرانی ادبیات کا اگر کوئی نقص ہے تو یہ کہ اس نے اجتماعی زندگی کی کبھی ترجمانی نہیں کی - ہر زمانے کے دیوان' یا اشعار یا تصانیف یا تو صرف حاکموں یا قوی دستوں کی خاطر سے لکھے گئے' یا زیادہ سے زیادہ خود نمائی کے خیال سے؛ اور کبھی کبھی شخصی یا مذہبی احساسات کی تعبیر کے لئے وجود میں آے - جمہور کی زندگی اور مختلف انسانی طبقوں کے اخلاق کا عکس ان تصانیف میں شاذ و نادر ہی نظر آتا ہے - برخلاف اس کے' یورپ کی جدید ادبیات کا بڑا حصہ یا تو تاریخی واقعات کے بیان اور کسی قوم کے اخلاق' عمومی خصوصیتوں اور حسیات کے ظاہر کرنے کے لئے لکھا گیا ہے' ورنہ پھر خود شاعر کی زندگی کے شعبوں اور اس کے سچے احساسات کا ترجمان ہے—

آج کل کے ہر مشہور اہل قلم کا کام یا تو حقائق کی تصویر کھینچنا ہوا کرتا ہے' یا پھر اس کا اس طرح تخیل کرنا کہ نقل اصل سے ٹکر کھاے' اور اسے

دلکش، سادہ اور شیریں پیرایے میں پیش کر دے۔ مثلاً شیکسپیر نے اپنے ڈرامے "یہودی تاجر" (Merchant of Venice) میں اگرچہ تمام تر ایک خیالی قصہ لکھا ہے لیکن اپنے زمانے کے یہودیوں کے تجارتی اور معاشرتی طور طریقوں کی تصویر کھینچنے میں اس نے اپنا کمال دکھا دیا ہے۔ دوسرے شاعروں اور مصنفوں کا بھی یہی حال ہے۔ تخیل اور حقیقی زندگی میں اس طرح ربط قائم کرنے ہی کا نتیجہ ہے کہ آج ہم کو ایسے کئی ناول نظر آتے ہیں کہ جن کے زیادہ تر قصے اس طرح بیان کئے گئے ہیں کہ پڑھنے والا انہیں واقعات سمجھتا ہے؛ حتیٰ کہ اُسے ژلورن کے افسانے "سیاحت، بہار" کے بھی سچ ہونے کا یقین ہو جاتا ہے۔ خاص کر ان افسانوں میں عشق، گناہ اور اسی قسم کے معرکات زندگی کا جو بیان کیا جاتا ہے وہ بہت کچھ اصلی اور فطری ہوتا ہے۔ ان کا ہر واقعہ ہمارے سامنے محسوس تر بن کر آتا ہے۔ برخلاف اس کے ہمارے یہاں کے افسانے زیادہ تر غیر فطری ہوا کرتے ہیں۔ ان کے قصوں کی جان زیادہ تر دیو، جادو، یا دیوار طلسم کے واقعات ہوا کرتے ہیں؛ اور ان کا تمام تر سرمایۂ دلکشی صرف معجزوں اور غیر فطری باتوں ہی پر مشتمل ہوتا ہے۔ مثلاً اگر آپ سکندر نامے سے نسیم عیار کی غیر معمولی حرکتیں اور حسین کرد نامے سے حمزہ عیار کی عجیب و غریب باتیں نکال دیجیے، تو ان کی حکایتوں کی حلاوت بہت کچھ جاتی رہے۔ ہمارے کلاسک (قدیم) اشعار اور تصانیف نے تو کبھی جمہور کی زندگی سے کوئی واسطہ رکھا ہی نہیں۔ اگر آج کوئی شخص عہد دارا، دور صفوی، حملۂ چنگیز اور عہد نادر شاہی سے قطع نظر کر کے صرف یہ چاہے کہ افسانے یا ناٹک کی قسم کی کوئی ایسی تصنیف اُسے مل جائے جس میں ناصرالدین شاہ قاچار کے عجیب و غریب حالات درج ہوں —— تو اُس کی یہ کوشش بارآور نہیں ہو سکتی۔ ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ ہماری ادبیات کو ہمارے اجتماعی یا تاریخی اخلاق کا آئینہ بننا کبھی نصیب نہیں ہوا، اور اسی وجہ سے وہ ایک بڑی دلکشی سے محروم رہی——

ناظرین کو یہ ہر گز خیال نہ کرنا چاھئے کہ راقم سطور ھذا ان تمام قابل قدر ایرانی تصانیف کا جو فردوسی کی "یوسف زلیخا" سے لیکر نظامی کے "خمسہ" تک عشق اور افسانوں کے متعلق ھوی ھیں' منکر ھے - یہ تصنیفیں اور انھیں کی طرح کے اور اعلیٰ درجے کے قصے بتاتے ھیں کہ اس وقت کو دیکھتے ھوے ایران کے اُستادوں کا کمال بہت کچھہ بلند درجہ تک پہنچ چکا تھا - بار بار کہا جا چکا ھے' اور اب پھر کہا جاتا ھے کہ راقم کا یہ منشا ھرگز نہیں ھے کہ بزرگوں کی بزرگی سے انکار کر دیا جاے - وہ تو صرف یہ چاھتا ھے کہ عصر حاضر کا روحی عنصر' اور اس کا اسلوب انشا ھماری ادبیات میں بھی پیدا ھو جاے —

ظاھر ھے کہ نئی نئی صنعتوں اور کمالوں کا زمانہ ضرور آکر رھے گا' اور کبھی فارسی زبان میں بھی جدید ادبیات کے خزانے پاے جائیں گے - ھم ایک نہ ایک دن چھری اور کانٹے سے کھانا کھانے پر مجبور ھوں گے - ایسا قلمکار کپڑا جس پر مجنون کی ایسی تصویر بنی ھو' جس کے سر پر چڑیوں نے آشیانہ بنا لیا ھے اس میں شک نہیں کہ ایک یادگار اور قدیم چیز ھے: اور ممکن ھے کہ اس قسم کا کپڑا کسی یورپی شاعر کے گھر کی دیوار پر بھی نظر آے —— لیکن ظاھر ھے کہ قدیم چیز کے سوا اس کی حیثیت اور کیا ھو سکتی ھے - اسی طرح سے ھم یہ نہیں چاھتے کہ ھمارے قابل تعریف خصائص اور ھماری قومی شخصیت صرف تاریخی میراث ھی بلے رھیں - پروفیسر براؤن ایران کے کاروانوں کے سفر کے طریقے سے بہت خوش ھوے تھے' لیکن ھم جانتے ھیں کہ ھمیں ریل کی پٹری کی بھی ضرورت ھے - فارسی زبان کسی زمانے میں شتر سوار تھی' لیکن آج کل اس کے لئے یہ ضروری ھے کہ برقی قوتوں سے کام لیا کرے - مختصر یہ ھے کہ فارسی زبان کو چاھئے کہ آج کل کے حسیات کی تعبیر کے لئے اپنے آپ کو تیار' اور آراستہ و پیراستہ کرلے - جیسا کہ بار بار عرض کیا جا چکا ھے' عبارتیں صرف معانی ھی کے سایے میں بڑھتی اور ترقی کرتی ھیں' اور اسی وجہ سے ھماری ادبی اور معنوی دونوں

ترقیاں ساتھ ساتھ ہونی چاہئیں۔ چنانچہ اسی انقلاب کی سولہ سالہ مدت میں جدید افکار اور احساسات کی مناسبت سے نئی عبارتیں اور نئی ادبیات بھی ظہور میں آ چکی ہیں: اور اس زمانے کے مشہور اخبارات، ترجمے، تالیفیں اور بعض اشعار پڑھنے، اور قدیم ادبیات کے ساتھ ان کا مقابلہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ چاہے یہ نئی چیزیں متانت اور کمال کے اعتبار سے پرانی ادبیات کی ٹکر کی نہ ہوں، لیکن جدت فکر، اور اسلوب بیان کی سادگی اور آزادی کے لحاظ سے زیادہ قرین فطرت، اور احساسات عمومی کے ترجمان کی حیثیت سے قدیم ادبیات سے بڑھی ہوئی ہیں—

سب سے آخر میں ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ہماری ادبیات کے اس نشاۃ ثانیہ کی ترویج قدرتی طور پر ہمارے سررشتۂ تعلیمات کے ہاتھ میں ہے۔ جب تک فنون لطیفہ کی تعلیم کے لئے مدرسے قایم نہ ہوں گے، اور خاص کر ادبیات میں، ہمارے ملک کے اہل ذوق نوجوانوں کو پہلے اسلامی اور ایرانی ادبیات کے فلسفہ اور تاریخ کی پوری تعلیم، اور اس کے بعد دنیا کی مشہور اقوام کی ادبیات کی تعلیم نہ دی جاے گی، اس وقت تک ہمارے ادبی تجدد کے مسئلہ کا حل جلدی نہ ہو سکے گا۔ تحصیلات قومی کی تعلیم بھی تمام تر انہیں اصولوں پر ہونی چاہئے جن پر آج کل ہوا کرتی ہے۔ تصنیفات کی تبویب (Classification) تنقید اور مقابلہ کا لحاظ رکھنا چاہئے؛ شاعروں کے اسلوب بیان، ان کی سوانح عمری، محیط اور خیالات کی تحقیق کی جاے، اور ان کے ادبی مسلک مثلاً تاریخ، حماسہ، غزل، تصوف وغیرہ کی بھی تدقیق ہونی چاہئے۔ ورنہ صرف غلط چھپے ہوے دیوانوں کا تحلیلی مطالعہ، اور "ولہ، ایضاً" کی طرح کے عنوانات کا پڑھنا، اور مکرر تذکروں اور عبارتوں کا مطالعہ جیسے "از فضلاے عصر خود بود" "هزار بیت از دیوانش به نظر رسید" "از مقربان سلطان سنجر بود" "در کنایه و ایجاز نظیر نداشت" وغیرہ ایران کے تازہ خیال نوجوانوں کی ادبی جلا کے لئے ہر گز

کافی نہ ہوگا—

ایران ہمیشہ گلزار ادب کی آبیاری اور نگہداشت کرتا رہا ہے اور اگر چہ آج کل اس کی پریشانی اور انتشار بمصداق :

باغ پریشان و سرو و کاج پریشاں

انتہائی حد کو پہنچ چکی ہے لیکن اب بھی وہ اپنے فرزندوں کی مدد کے بھروسے پر ایک نئے اور روشن تر مستقبل کی آس لگا سکتا ہے—

و من اللہ التوفیق !

بجنوری مرحوم کی وفات پر

از

(جناب مولوی سید ہاشمی صاحب)

صبح کی آمد نہ تھی، اے دیدۂ ظلمت نصیب
وہ، کسی فوق النظر تارے کی پہلی تھی کِرن
اِس فضائے پُر کدورت میں نہ تھا اُس کا وطن

———: o :———

اب کہاں وہ نور شیریں ... ہاں مگر اُس کی جھلک
ہو اگر باقی تو ہو شبنم کی نازک روشنی
یا سر شب کھلنے والی موتیا کی چاندنی!

کیا کتبخانۂ اسکندریہ عربوں نے جلایا؟

از

(جناب سید حسن برنی، بی - اے، ال ال - بی)

زمانۂ حال کے مستشرقین میں لیونے کائتانی (Leone Caetani) قرون اولی کی اسلامی تاریخ کا سب سے بڑا مغربی محقق و مبصر ہے - وہ اٹلی کا ایک رئیس ہے جس نے اپنی علمی زندگی کا نصب العین اسلامی تاریخ کی تدوین قرار دیا ہے - یہ امر بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ اس میدان میں اُس کے کارنامے نہایت مہتم بالشان ہیں - اُس نے سنہ ۱۹۰۵ع سے تاریخ اسلام کی تدوین کا بیڑا اُٹھایا اور Annali dell' Islam یا "تواریخ اسلام" کے نام سے اٹالین زبان میں ایک مبسوط تصنیف شایع کرنی شروع کی جس کی آٹھ ضخیم جلدیں خلیفۂ سوم کے قتل اور خلیفۂ چہارم کے انتخاب کے حالات تک حسب ذیل تفصیل سے اٹلی کے شہر میلانو Milano سے شایع ہو چکی ہیں :—

جلد اول - دیباچہ و سنہ ۱ھ لغایت سنہ ۶ھ صفحات ۱۶ و ۷۴۰
مطبوعۂ سنہ ۱۹۰۵ع

جلد دوم - جزو اول سنہ ۷ھ لغایت سنہ ۱۱ھ صفحات ۷۸ و ۷۱۹
مطبوعۂ سنہ ۱۹۰۷ع

جزو دوم سنہ ۱۱ھ لغایت سنہ ۱۲ھ صفحات ۷۲۱ لغایت ۱۵۶۷
مطبوعۂ سنہ ۱۹۰۷ع

جلد سوم - سنه ۱۳ھ لغایت سنه ۱۷ ھ صفحات ۸۲ و ۹۷۳
مطبوعۂ سنه ۱۹۱۰ ع

جلدچہارم - سنه ۱۸ ھ لغایت سنه ۲۲ ھ صفحات ۳۵ و ۷۰۱
مطبوعۂ سنه ۱۹۱۱ ع

جلد پنجم- سنه ۲۳ھ صفحات ۳۶ و ۵۳۲
مطبوعۂ سنه ۱۹۱۲ ع

جلد ششم - انڈکس جلدھاے سوم و چہارم وپنجم صفحات ۸ و ۲۱۸
مطبوعۂ سنه ۱۹۱۳ع

جلد هفتم - سنه ۲۴ ھ لغایت سنه ۳۲ ھ صفحات ۵۵ و ۶۰۰
مطبوعۂ سنه ۱۹۱۴ ع

جلد هشتم - سنه ۳۳ ھ لغایت سنه ۳۵ ھ صفحات ۳۲ و ۴۴۶
مطبوعۂ ۱۹۱۸ ع

کاتیانی نے تواریخ اِسلام کا ایک کثیرالتعداد ذخیرہ جمع و مطالعه کیا ھے اور هر هر مبحث اور هر هر واقعے پر تمام مشرقی و مغربی مصنفین کے بیانات کو جانچ تول کر تحقیقات کو انتہا تک پہنچا دیا ھے - هر سنه کے اخیر میں اُن اعیان کے مفصل حالات لکھے هیں جن کی وفات اُس سنه میں واقع هوئی - اور هر مبحث، هر واقعه، هر سوانح عمری کے متعلق اپنے ماخذوں کے حوالے دئے هیں —

ظاهر ھے که اِس شرح و بسط کے ساتھه اپنی پوری زندگی میں مسلسل کوشش کے باوجود مصنف کو ایک یا سوا ڈیڑہ صدی سے زیادہ مدت کے واقعات لکھنے کی امید نہیں هوسکتی جو اِسی انداز و رفتار سے تیس چالیس جلدوں سے کم میں ختم نہیں هوسکتے مصنف نے یه دیکھکر اِس کتاب کے دوران تصنیف هی میں ایک دوسری تصنیف مرتب کرنی شروع کر دی جس کا نام "Chronographia Islamica" یا "سنین اِسلام" ھے - یه کتاب سنه ۱ ھ سے شروع هوکر اس وقت تک

سنہ ۱۳۲ ھ تک پہنچ چکی ہے اور اُس میں سنہ وار واقعات مختصرالفاظ میں لکھکر اُن کے جملہ مآخذ بتفصیل شمار کرا دیے گئے ہیں اور ہر سنہ کے آخیر میں اُن اعیان کے نام اور ذرایع معلومات بتا دیے ہیں جنھوں نے اُس سنہ میں وفات پائی - اس کتاب کا منشا یہ ہے کہ مصنف اپنے بعد میں آنے والے اہل قلم کے لئے ایک ایسا ذخیرۂ معلومات چھوڑ جاے، جس کی مدد سے وہ اُس کے کام کو بہ سہولت جاری رکھہ سکیں اور اُس کا جمع کیا ہوا علمی سرمایہ اور اِس وقت تک کی تمام کوششیں رائگاں نہ جائیں - یہ کتاب بھی اٹالین زبان میں ہے اور پیرس میں طبع کرائی گئی ہے اور "تواریخ" کی طرح بڑی تقطیع کے ۱۷۱۶ صفحات پر چھپی ہے - ابھی تک اُس کی صرف جلد اول ہی چند اجزا میں شایع ہوئی ہے، جو بنو امیہ کی سلطنت کے خاتمے پر ختم ہوتی ہے —

ایک تیسری کتاب جس کی صرف پہلی اور تیسری جلدیں شایع ہوئی ہیں، (Studi Storia Orientale) یا "مضامین متعلق تاریخ مشرقی" ہے - اس کتاب میں مصنف نے عرب کی تاریخ قبل از اسلام اور پیغمبر صاحب صلعم اور خلیفۂ اول کے متعلق متعدد مضامین مسلسل ابواب کی شکل میں تحریر کئے ہیں، جن میں قرون اولیٰ کے تاریخی مطالعہ و تحقیقات کا لب لباب عام فہم عبارت میں پیش کیا گیا ہے - مصنف کی دیگر تصانیف کی طرح یہ بھی نہایت قیمتی تصنیف ہے —

مجھے اٹالین زبان سیکھنے کا شوق کاتیانی کی تصانیف ہی دیکھکر ہوا تھا اور جو کچھہ شد بد اِس وقت تک اس زبان میں مجھے ہو گئی ہے، وہ کاتیانی ہی کی بدولت ہے —

کاتیانی نے "تواریخ اسلام" Annali dell' Islam کی جلد ہفتم میں اس مبحث پر کہ آیا کتب خانۂ اسکندریہ عربوں کے ہاتھوں جلا، یا نہیں، ایک مضمون لکھا ہے، جو صفحہ ۱۱۹ لغایت صفحہ ۱۲۵ پر درج ہے - اُس کا ترجمہ اٹالین زبان سے کر کے ناظرین کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے - اِس مبحث پر علاوہ اُن مصنفین نے

جن کا تذکرہ کاتیانی نے کیا ہے اور بھی متعدد اہل قلم نے لکھا ہے - مثلاً مستشرقین میں موسیو سیدیو M. Sedillot اور ہماری زبان میں مولانا شبلی مرحوم - مولانا شبلی کے مضمون کے اخیر میں مستشرق کریل (Krehl) کا مضمون بھی شامل ہے جس کا ترجمہ جرمنی زبان سے مسٹر سید علی مرحوم نے مولانا کے لئے کیا تھا - کتب خانۂ اسکندریہ کا مضمون مولانا شبلی کے بہترین مضامین میں شمار کئے جانے کے لائق ہے - ہمیں اُمید ہے کہ کاتیانی کا مضمون بھی، جو اپنی جامعیت اور وسیع النظری کے لحاظ سے نہایت اعلی رتبہ رکھتا ہے، دلچسپی کے ساتھ پڑھا جائے گا اور اُن بہت سی غلط فہمیوں کے ازالہ کا موجب ہوگا جو عناد و تعصب کی وجہ سے قرون اولی کی تاریخ اسلام کے متعلق جا بجا پھیلی ہوئی ہیں-

سید حسن برنی |

عربوں کی فتح اسکندریہ کا بیان کرتے وقت یہ نا ممکن ہے کہ اُس مشہور روایت کو بغیر بحث کئے چھوڑ دیا جائے جو کتب خانۂ اسکندریہ کی بربادی کے متعلق متداول ہے - یہ عظیم الشان کتب خانہ بحیثیت ایک ایسے معبد کے شہرت رکھتا ہے، جہاں قدیم یونانی لٹریچر کے کثیر ذخایر جمع تھے - یہ روایت تاریخ کا جزو لاینفک بن گئی ہے - اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ اس قسم کی معرا اور سادہ تاریخ واقعات کو پسند نہیں کرتے جیسی کہ ہمارے متشکک نقاد مرتب کرنا پسند کرتے ہیں - لوگ واقعات کی یاد کو یا تو بطور واقعات فخر و احتشام یا بطریق تنبیہ و عبرت و تفریح زندہ رکھنا چاہتے ہیں - جب کبھی واقعات کی سادہ تاریخ فنون لطیفہ کے لباس سوانگ کے روپ میں ضروری رنگ آمیزی کے ساتھ پیش نہیں کی جاتی تو عوام الناس کا متخیلہ از خود اپنے دماغ میں جو مایل بفنون لطیفہ و اخلاقیات ہوتا ہے ایک ایسی روایت پیدا کر لیتا ہے جو اخلاقی فضا کے کارآمد ہو سکے - یہی روایت آئندہ چل کر خود حضرت انسان کے لئے ہوّا بن جاتی اور مہیب صورت اختیار کر لیتی ہے —

اگر یہ عام پسند ایجاد خوشگوار ہے یا یہ روایت دماغ انسانی کے فنون لطیفہ کے مذاق ایجادات کے دوامی اور بنیادی اصولوں سے مطابقت رکھتی ہے تو اُس کا مستقبل قایم ہو جاتا ہے اور اُس کی بنیادیں تاریخ کی بار آور فضا میں ایسی مستحکم ہو جاتی ہیں کہ اُن کا زائل کرنا اور واقعات کی خالص صداقت کو از سر نو بحال کرنا نہایت مشکل ہو جاتا ہے —

ایسی روایات کی تحلیل کا کام ہنوز دشوار اور ابتدائی منازل ترقی میں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بمقابلہ وضع روایات کے سہل اور خوشگوار کام کے جو ارتقاے تمدن انسانی کے ہمیشہ هم عناں رہا ہے، تنقید کا کام نقاد کو سخت الجھن میں ڈال دیتا ہے۔ تنقید گویا الزام و تہمت ہے، جو نا مبارک اور افسوس ناک خلا قایم کر دیتی ہے، یا کسی واقعے کی ایسی مؤثر اور کاری پردہ دری ہے، جس سے ہمارے زمانے کے لوگ بھاگتے ہیں لیکن با وجود ان تمام باتوں کے وہ پشتہا پشت سے نسلاً بعد نسلٍ انسان کے جذبات و تعقل کے ساتھ ساتھ بہیئت کلی متوارث چلی آتی ہے —

یہ جملے امور اسکندریہ کے کتب خانے کی مفروضہ تباہی کی روایت پر بھی پورے طور پر صادق آتے ہیں۔ اس روایت کی تہ میں فی الواقع ایک حقیقت مخفی ہے۔ یہ روایت عام پسند اور مرتب شکل میں اِس معاندانہ جذبے کو پیش کرتی، یا اُس کی تائید کرتی ہے کہ فتح اسلام کا ماحصل یہ ہے کہ: ایشا میں تمام قدیم علمی ذخائر کی بربادی کا، جس کا آغاز روز نیت کے ساتھ اور جس کا فروغ رومانوی بائیزنطینی افواج کی معیت میں ہوا، نا قابل تلافی انحطاط و اختتام ہو گیا، سدا کے لئے عربوں کا جو ایشیا کی سامی نسل کے احیا کے نقیب بن کر آئے تسلط اور دیگر اقوام کا تنزل وقوع میں آگیا، حدود کے صحراؤں کے ناکے کھل گئے اور زوال پذیر بائیزنطینی حکومت پر تباہی کا پہاڑ آ ٹوٹا —

ہمارے اِس قیاس کی تائید عیسائی مورخ ابوالفرج ابن العبری

Gregoris Abulfaragis bar Hebraeus کے الفاظ سے بھی جو اُس نے اس روایت کے متعلق تیرھویں صدی عیسوی کے اختتام پر لکھے ھیں ھوتی ھے - ابوالفرج کا انتقال سنہ ۶۸۵ھ میں ھوا- یہ مورخ اُن سب سے پہلے مصنفوں میں ھے جنھوں نے اس مشہور کتبخانہ کی بربادی کے افسانہ کو جیسا کہ ھم آگے معلوم کرینگے ابن القفطی سے ماخوذ کیا ھے --

ابوالفرج لکھتا ھے کہ " اس زمانے میں (یعنی مسلمانوں کے فتوحات مصر کے عہد میں) مسلمانوں میں بھی یحییٰ Giovanni جو ھم میں " غراماطیقوس " یعنی "النحوی" کے لقب سے نامزد ھے مشہور ھوا - وہ اسکندریہ کا رھنے والا اور مذھب عیسوی کے فرقۂ یعقوبیہ سے تعلق رکھتا تھا اور ساوری (Severus) کے تعلیمات کا پرجوش حامی تھا' بعد میں وہ مذھب عیسوی کے مسئلہ تثلیث سے منکر ھوگیا - مصر کے پادریوں نے جمع ھوکر جلسہ کیا اور اُس سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنے خیال سے دست بردار ھوجائے- اُس نے تعمیل سے انکار کردیا اور پادریوں نے اُسے اُس کے عہدہ سے بر طرف کردیا- وہ اسکندریہ کی فتح کے وقت زندہ تھا اور فتح کے بعد عمرو بن العاص کی خدمت میں حاضر ھوا - عمرو بن العاص نے پہلے ھی سے اُس کے خیالات کی شہرت سن رکھی تھی' عمرو نے اُس کا نہایت احترام کے ساتھہ خیر مقدم کیا اور اُس کی فلسفیانہ تقریر کو سنا- ابھی تک عربوں میں فلسفہ کا رواج نہیں ھوا تھا - اُس کی تقریر سن کر عمرو متوحش اور پریشان ھوا لیکن چوں کہ نہایت ذھین' سننے کا شایق' فراخ دل اور صحیح الفکر شخص تھا اُس نے یحییٰ کو اپنا مصاحب بنالیا اور کسی وقت بھی اپنے ساتھہ سے علیحدہ نہیں کرتا تھا- ایک دن یحییٰ نے اُس سے کہا کہ "تم نے اسکندریہ کے تمام حواصل پر قبضہ پا لیا ھے اور جملہ موجودات پر جو تمھیں دستیاب ھوئیں مہریں لگادی ھیں- جس چیز میں تمھارا فائدہ ھے میں اُس کے لئے تم سے خواھش نہیں کرتا لیکن جس چیز میں تمھارا کوئی فائدہ نہ ھو اُس کے ھم البتہ زیادہ مستحق ھیں اُسے ھمیں بخش دیا جائے"- عمرو نے کہا "وہ کونسی چیز

ھے جس کی تمھیں خواھش ھے"۔ یحیی نے کہا فلسفه کی کتابیں (کُتب الحکمه) جو بادشاھوں کے خزانوں (خزاین الملوکیه) میں اس وقت تک محفوظ ھیں"۔ عمرو نے جواب دیا مجھے اختیار نہیں که میں از خود اس بارہ میں کوئی حکم دے دوں ' پہلے مجھے امیرالمومنین عمر بن الخطاب (رض) کی اجازت لینی پڑیگی"۔ چنانچه عمرو نے امیرالمومنین کو لکھا اور اُس میں یحیی النحوی کی تقریر بھی جو اُس نے کی تھی درج کی - امیرالمومنین عمر کا جواب اس مضمون کا موصول ھوا " جن کتابوں کا تم نے ذکر لکھا ھے اگر وہ مطابق کلام الله ھیں تو کلام الله کے موجود ھوتے ھوتے وہ سب غیر ضروری ھیں اور اگر اُن میں کتاب الله کے خلاف کچھه ھے تو اُن کی کوئی ضرورت نہیں اور اُنھیں تلف کردینے کی طرف توجه کرو"۔ عمرو بن العاص نے اِن کتابوں کو اسکندریه کے حماموں میں بانٹنا شروع کیا جہاں وہ حمام کی بھٹیوں میں جلتی رھیں اور چھه مہینے تک کافی ثابت ھوئیں - (اے پڑھنے والے) اس واقعه کو سن اور تعجب کر ! "

(ابوالفرج صفحه ۱۷۵ - ۱۷۶)

اس روایت نے مصنفین اور علما کے تصور کو اپنی طرف کرلیا اور اُن لوگوں نے جو مذھبی بنا پر پیروان اِسلام سے عناد رکھتے تھے اس روایت کو بڑی خوشی کے ساتھه قبول کیا اور (بخیال خود) مسلمانوں کو تمدن قدیم و تہذیب عام کا دشمن قرار دیکر مجرم ثابت کرنے کی مسرت حاصل کی - گبن (Gibbon) نے جو مسیحیت کی جنبه داری کا کوئی قوی جذبه اپنے اندر نہیں رکھتا تھا اور تمدن اسلام کے مظاھر کا مداح تھا اپنی تاریخ کے باب ۱۵ میں مختصر طور پر اس قصے کا ذکر کیا ھے اور خاص طور پر اُن الفاظ کو جتا یا ھے جن پر ابن العبری نے اس قصے کو ختم کیا ھے — گبن نے صاف اور صریح طور پر اس قصے کی صداقت سے انکار کیا ھے اور اس طرف توجه دلائی ھے که دوسرے عیسائی مورخ جو ابوالفرج سے پہلے ھوے ھیں یعنی ایوتی کیوس (Eutychuis) اور المکین قطعاً کُتب خانه اسکندریه کی تباھی کا ذکر نہیں کرتے '

حالانکه انہیں مسلمانوں سے کسی قسم کی ہمدردی نہیں ہے اور ایک ایسے واقعہ کے تحریر کرنے میں جو مسلمانوں کی سخت تذلیل کا موجب ہوسکتا ہے انہیں بڑی خوشی ہوتی - گبن کے خیال میں یہ امر ناقابل یقین ہے کہ عرب ایسے متعصب تھے کہ وہ کتابوں کو برباد کرتے - بر خلاف اس کے گبن نے دکھایا ہے کہ اس کتبخانے کی اصلی تباہی پہلے ہی وقوع میں آچکی تھی جبکہ بسلسلۂ مدافعت قیصر جیولیوس (Julius Caesar) کے ہاتھوں وہ جل چکا تھا اور بعد ازاں عیسائیوں کا مجرمانہ تعصب سب سے بڑھکر بت پرستوں کے عہد کے تمام آثار علمیہ و باقیات فنون لطیفہ کی تباہی کا موجب ہوا تھا - گبن نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر قیصر انٹونینی (Antonini) اور قیصر طیو دوسیو (Teodosis) کے زمانے کے شواہد تاریخی کو یکجا کیا جاے تو ثابت ہو گا کہ سیریپس (Serapis) کے مندر اور محل میں وہ چار لاکھ یا سات لاکھ کتابیں عربوں کے حملے کے وقت موجود ہی نہ تھیں جو بطلیموسان مصر کی علمی تشنگی اور اظہار شوکت کے جوش سے وہاں بہم پہونچائی گئی تھیں —

اب ہم اُن شریف خیالات اور صداقات کے وجدان صحیح کا جس کے ساتھ گبن نے اس روایت کا خاتمہ کیا ہے تذکرہ ختم کر کے یہ لکھنا ضروری سمجھتے ہیں کہ لےبے (Lebeave) نے سلطنت بائز نطینی کی تاریخ کبیر میں (دیکھو کتاب ٥٩ حصہ ١٢ جلد ١١ صفحہ ٢٩٥ - ٢٩٦) نہ صرف کُل روایت کو نقل کیا ہے بلکہ اُس کو صحیح تسلیم کرتے ہوے تائید میں عرب اور مسلمان مصنف عبداللطیف متوفی سنہ ٦٢٩ھ کی شہادت پیش کی ہے جو ابوالفرج سے نصف صدی پہلے تھا - مصر کے اِس مصنف نے اسکندریہ کے کسی عظیم الشان آثار عتیقہ کا ذکر کرتے ہوے لکھا ہے کہ میں یقین کرتا ہوں کہ یہ عمارت وہ بر آمدہ ہے جہاں ارسطو اور اُس کے بعد اُس کے شاگرد تعلیم دیا کرتے تھے اور یہیں وہ بیت الحکمہ (اکاڈیمی) بھی تھا جو اسکندر اعظم نے بنایا تھا جب کہ اسکندریہ کی بنیاد ڈالی تھی اور نیز وہ کُتب خانہ بھی تھا جو عمر کی اجازت سے عمرو (بن العاص) نے جلوا دیا تھا —

(عبداللطیف صفحہ ١٨٣ ترجمہ فرانسیسی)

دے ساسی (De Sacy) نے اس ایڈیشن میں جو عبداللطیف کی کتاب کا شایع کیا ہے (صفحہ ۲۴۰-۲۴۴ پر) ایک طویل اور عالمانہ نوٹ اس مبحث پر لکھا ہے اور ابوالفرج کے زمانے سے لیکر اُس وقت تک جن مصنفین نے اس روایت کی صحت کے موافق (مثلاً لینگلس Langles اور رهائٹ White نے) اور خلاف (مثلاً رائن هارڈ Reinhard وسینٹ کروآ Saint Croix نے) جو کچھہ کہا ہےسب کا مختصر طور پر تبصرہ کرتے ہوے اس روایت کی سچائی کو تسلیم کیا ہے، بغیر اس کے کہ اس امر کے متعلق قدیم مورخین کے بیانات پر کوئی غور کیا گیا ہو۔ سیف بن عمر کے ہاں اس روایت کا کوئی وجود نہیں پایا جاتا، حالانکہ یہ سیف بن عمر وہ شخص ہے جس نے المداین کی لوٹ کے متعلق (دیکھو کاتیانی کی تواریخ سنہ ۱۶ ہجری ۱۹۴-۲۰۵) مفصل طور پر نہایت جزئی واقعات تک کو بیان کردیا ہے۔ برخلاف اس کے دے ساسی نے بحوالہ حاجی خلیفہ (جلد سوم صفحہ ۹۰-۹۱) ابن خلدون سے ایک مقام پیش کیا ہے (ابن خلدون مقدمہ جلد سوم صفحہ ۱۲۴-۱۲۵) جس میں اُس مورخ نے ساسانیوں پر فتحیاب ہونے کے بعد خلیفہ عمر کے حکم سے سعد بن ابی وقاص کے ہاتھوں ایران کی بہت سی کتابوں کے تلف ہونے کا ذکر کیا ہے اور جس میں خلیفہ مذکور کی زبان سے وہی الفاظ ادا کئے گئے ہیں جو کتب خانہ اسکندریہ کے برباد کرنے کے لیے نقل کیے جانے بتائے جاتے ہیں—

دے ساسی نے علاوہ ازیں متاخرین میں سے حاجی خلیفہ کا حوالہ دیا ہے جو (دیکھو صفحہ ۷۸ کتاب جامع المعلومات مصنفہ فلوغل Flugel) لکھتا ہے کہ شروع زمانے میں عربوں نے اُن ممالک میں جو انہوں نے فتح کئے بہت سی کتابیں جلا دیں (یہ امر توجہ طلب ہے کہ یہ بیان لفظ "یروی" سے شروع کیا جاتا ہے [یعنی ماخذو راوی مفقود ہیں]—

اس بات کو جانتے ہوئے کہ کتب خانہ اسکندریہ کی بربادی اُس مشہور کتب خانہ سے بوجوہات بین جن کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے متعلق نہیں ہوسکتی،

دے ساسی نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہ ایک اور کتب خانہ تھا یا عیسائیوں کا کوئی کتب خانہ تھا جو قدیم کتب خانے کے مقابلے میں چنداں حیثیت نہ رکھتا تھا لیکن عربوں کے آنے سے پہلے اُس قدیم معبد میں قایم کر دیا گیا تھا - دے ساسی نے اُروسیوس (Orosius) پسر ارمیاس Hermeas ساکن امو نیوس (Ammonius) اور یحییٰ فیلو پونوس (Giovanni Philoponus) کی شہادتیں اس امر کے متعلق پیش کی ہیں کہ پانچویں صدی عیسوی میں جو واقعات پیش آئے اُن کے باعث بطلیموسان مصر کا قایم کیا ہوا کتب خانہ معدوم ہوچکا تھا اور قطعاً خالی تھا—

کتب خانۂ اسکندریہ کی بربادی کے متعلق بٹلر (Butler) نے بھی طویل بحث کی ہے (دیکھو صفحہ ۴۰۱ - ۴۲۶) اور ثابت کیا ہے کہ یہ روایت غلط ہے اور اپنی تائید میں بہت کچھہ دلایل و شواہد بھی پیش کیے ہیں جن میں سے بعض ضعیف اور بعض قوی ہیں - قوی دلایل میں سے ایک یہ ہے کہ یحییٰ النحوی جس کا ذکر ابن العبری نے کیا ہے وہی شخص ہے جو یحییٰ فیلو پونوس (Giovanni Philoponus) کہلاتا ہے ' یہ شخص عمرو کے مصر آنے سے پہلے مر چکا تھا لہذا یہ سارا قصہ ہی سر سے پیر تک جھوٹا ہے - علاوہ ازیں بٹلر نے تمام قدیم مصنفین کے شواہد پر تبصرہ کیا ہے اور یہ نتیجہ نکالا ہے کہ مسیح سے ۴۸ برس پہلے کتب خانہ اسکندریہ قیصر جولیوس کی جنگ اسکندریہ کے زمانے میں اسکندریہ کے جلنے کے ساتھہ ہی جل گیا تھا - مزید برآں بٹلر نے اور بھی واقعات تاریخی یاد دلائے ہیں جن سے اسکندریہ کی عمارات کی تباہی ثابت ہوتی ہے یا وہ تمام حوادث ظاہر ہوتے ہیں جو بعد میں وقوع میں آئے —

ناظرین کی سہولت کے لیے ہم ذیل میں المقریزی کا بیان جو عبداللطیف کی کتاب سے جزئی طور پر ماخوذ ہے پیش کرتے ہیں:-

" عمودالسواری: یہ عمود سرخ پتھر سے بنا ہوا ہے اور آلصوّان کی وسیع

عمارت سے تعلق رکھتا ھے - اس کے گرد ایک معبد تھا جس میں چار سو ستون لگے ھوے تھے - سلطان صلاح الدین یوسف بن ایوب کے عہد (سنہ ۵۶۴ ھ - سنہ ۵۸۹ ھ) میں اسکندریہ کے عامل قر آغا کے حکم سے یہ ستون اُکھاڑ ڈالے گئے اور انھیں توڑ کر اُن کے ٹکڑے ٹکڑے کردئیے گئے اور سمندر کے ساحل میں اس غرض سے ڈال دئیے گئے کہ ضرورت کے وقت کام آئیں اور دشمنوں کے جہازوں کی لنگر اندازی میں مخل ھوں۔ بعض دیگر اشخاص کا یہ بھی قول ھے کہ یہ عمود منجملہ اُن متعدد ستونوں کے ھے جن پر رواق ارسطو کی عمارت قائم تھی اور جہاں ارسطو درس حکمت دیا کرتا تھا وھاں ایک کتابوں کا ذخیرہ بھی موجود تھا جو خلیفہ عمر بن الخطاب کی ھدایت پر عمرو بن العاص کے حکم سے تلف کردیا گیا المقریزی خطط جلد اول صفحہ ۱۵۹ سطور ۲۶ لغایۃ ۳۰) ...

لیو ڈالف کریل (Ludolf Krehl) نے مستشرقین کی بین الاقوامی مجلس کی روئداد سنہ ۱۸۷۸ ع جلد اول صفحہ ۴۳۳ - ۴۵۳ —

(Alli del IV Congresso Internazionale degli Orientalisti Fineuze 1878, Vol 1 P. 433-454)

میں ایک مضمون " کتب خانۂ اسکندریہ کے عربوں کے ھاتھوں برباد ھونے کی روایت'' پر لکھا ھے جس میں مختلف دلائل کے ساتھ اس روایت کی تردید کی ھے اور اُسے محض ایک افسانہ قرار دیا ھے —

مستشرق موصوف کے دلائل عمدہ ھیں اگرچہ جہاں تہاں وہ عام نوعیت کی بحث میں گم ھوکر رہ گئے ھیں جو اصل مبحث سے کسی قدر دور لے جاتی ھے - کریل نے اُن تمام دشواریوں کو دکھایا ھے جو اِس روایت کے متعلق پیش آتی ھیں - مثلاً اسکندریہ کی فتح سے چھہ صدی بعد تک کتب تواریخ کا سکوت - کریل نے یہ بھی لکھا ھے کہ اغلب یہ ھے کہ بغداد کے سنہ ۶۵۶ ھ (۱۲۵۸ ع) میں فتح ھونے کے وقت ھلاکو مغل کے حکم سے بغداد کا عظیم الشان کتب خانہ جو تلف ھوا (دیکھو انتہاءات

و انتخابات Notices Et Extraits جلد چہارم صفحہ ۵۶۹) اُسی کو پیش نظر رکھنے ہوے ابن العبری (ابوالفرج) کے دل میں (جو سنہ ۱۲۲۶ع میں پیدا ہوا تھا) اس قصے کو بآسانی اپنی تاریخ میں لکھنے کا خیال پیدا ہوا - کریل نے تفصیل کے ساتھہ یہ بھی دکھایا ہے کہ جب عربوں نے اسکندریہ کو فتح کیا تو کتب خانۂ اسکندریہ کا وجود بھی نہ تھا اور سنہ ۴۷ یا سنہ ۴۸ قبل مسیح سے لیکر جب کہ اسکندریہ کے محاصرے کے وقت قیصر جولیوس نے عجائب خانۂ اسکندریہ کو جلوا دیا اُس وقت تک جب کہ مصر میں بازنطینی حکومت کا خاتمہ ہوا اُن سیاسی کشمکشوں کے باعث جو وقتاً فوقتاً اسکندریہ میں ہوتی رہیں یہ کتب خانہ تلف اور معدوم ہو چکا تھا -

لومبروسو (Lumbroso) نے (دیکھو روئداد اکاڈیمی دی النسی شعبۂ اخلاقیات جلد ۱۲ سلسلۂ پنجم صفحہ ۳۱۱ مطبوعۂ سنہ ۱۹۰۳ع

(Rendiconti dell R. Academia dei Lincei Classe science morale, serie quinta, Vol. XII 1903, p. 311)

اس سوال میں پھر کچھہ نئی جان ڈالی ہے اور ایک شامی تاریخ میں جسے ہمارے دوست گویڈی نے شایع کیا ہے (Chronicum Anonymum, nei corpus script. Christ. Oriental ed Chabot etc. Script. Syri. Versio, Series Tertia, tomus IV p. 22) اسکندریہ کے مشہور کتب خانے کا حوالہ نکالنا چاہا ہے - اس کتاب میں ایک خزانے یا محافظ خانے یا کتب خانے کا ذکر ہے لیکن اُس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اُس سے مورخ کا منشا اس عظیم الشان اور مشہور کتب خانے ہی سے ہے نہ اُس کتاب کے اُس مقام کو پڑھنے سے یہ شبہ ہوتا ہے - یہ ظاہر ہے کہ اسکندریہ جیسے بڑے خوش حال اور شایستہ شہر میں ہر زمانے میں بہت سے بڑے کتب خانے ہو سکتے تھے —

پادری شیخو (Cheikho) نے کچھہ عرصہ ہوا کتب خانۂ اسکندریہ اور عربوں

کے هاتھوں اُس کے برباد هونے کی روایت کے جعلی هونے کے متعلق جو کچھه لکھا هے اُس میں کوئی نئی بات نہیں دکھائی گئی هے (دیکھو المشرق نمبر۴ بابت اپریل سنه ۱۹۱۱ صفحه ۲۹۹–۳۰۷ و نمبر۲ سنه ۱۹۱۱ صفحه ۳۸۸–۳۹۳ "علوم عرب و کتب خانۂ اسکندریه کا جلایا جانا" نیز رسالۂ مذکور بابت ۱۲ دسمبر سنه ۱۹۱۲ع صفحه ۹۱۲ - ۹۱۸ ضمیمۂ مضمون شیخ فدا حسین)۔ موسیو کیریلو میکیر M. Kyrillos macaire نے بھی اس مبحث پر خامه فرسائی کی هے (دیکھو رسالۂ انجمن خدیویه جغرافیه سلسلۂ هفتم نمبر۸ صفحه ۴۲۳ – ۴۶۰ Bulletin de la Societe Kedeeviale de Geographie, VII Serie N. 8 p. 423 - 460)

اس مضمون میں بہت کچھه نیا مواد بزرگان کلیسا کی کتابوں و دیگر قدیم تواریخ سے جو بازنطینی عہد کی تصنیف هیں، جمع کیا گیا هے - اور یه ثابت کرنے کی کوشش کی گئی هے کہ اگر چه فتوحات عربیه کے وقت بطلیموسان مصر کا قایم کیا هوا کتب خانه موجود نه تھا، لیکن ایک دوسرا کتب خانه ویسا هی موجود تھا جسے اسکندریه کی کثیرالتعداد آبادی نے قائم کیا تھا اور جو بعد میں عمر کے حکم سے برباد کیا گیا - اِس قبطی مسیحی عالم کے دلائل کی تردید میں اُسی رسالے میں جلد ۸ نمبر۱۰ صفحه ۵۵۳ – ۵۷۰) محمد مسعود ی وکیل عدالت اپیل قاهرہ نے ایک مضمون لکھا هے ' جس میں ثابت کیا گیا هے که پادری صاحب موصوف نے جو نتائج اخذ کئے هیں صحیح نہیں هیں - یه دونوں مضامین پڑھنے کے قابل هیں اور اُن سے اِس پورے مبحث پر مفید روشنی پڑتی هے—

اس مشہور مبحث پر ابتداءً جو خیالات پیش کئے گئے هیں اُن کے علاوہ یه ضروری هے که ایک اور اهم پہلو بھی جس پر مختصر تبصرہ کافی هوگا پیش کر دیا جاے - اب تک جو کچھه بھی بحث کی گئی هے وہ تھی اور مکتبی نوعیت کی هے - ضروري معلوم هوتا هے که اس مسئله کو زیادہ بلند اور جامع نظر سے بھی جانچا جاے—

ہم نے اس بات کو بتایا ہے اور بکرّات و مرات بتایا ہے کہ فتوحات کی طرف عرب کے لوگ شان و شوکت، طاقت و دولت کے لئے مائل ہوئے تھے - وہ مسلمان ضرور تھے، لیکن اُن کا مطمح نظر اُس وقت چنداں لوگوں کا مذہب تبدیل کرانا، یا دوسرے مذہب کے لوگوں پر سختی کرنا یا ایک ہی خیال پر سب کو مجبور کرنا نہیں تھا - بلکہ وہ اُس وقت چیزوں کو اُن کی پہلی حالت پر چھوڑ دینا چاہتے تھے - اس لئے کہ اس طرح پر خزانے میں خراج مملکت بسہولت و بافراط داخل ہو جاتا تھا - نہ اُس عہد میں مغلق و مبہم رجحانات وجود رکھتے تھے اور نہ دوسرے مذہبوں اور تمدنوں کو دبانے کا کوئی خیال تھا - جو شخص کہ تحریک اسلامی کے ارتقا کی تاریخ کو اُس کے ہزارہا مظاہر تمدنی، سیاسی، ادبی، فقہی، مالی، انتظامی و نیز بظاہر فنون لطیفہ کو بغور مطالعہ کرے گا اُس کو بار بار یہ امر محسوس ہو گا کہ یہ تحریک ہرگز برباد کُن نہ تھی بلکہ وہ اپنے اندر اُن تمام اشیا کو جذب کرنا چاہتی تھی جو دنیا میں اُس وقت موجود تھیں - اسلام نے ایشیاے قریب کے تمام تمدن کو اپنے اندر جذب کیا اور اُس پر نئی جلا بھی کی جس سے سطحی نظر سے دیکھنے والا دھوکے میں پڑ جاتا ہے، لیکن اسلامی عہد کے مشرقی دنیا کی تاریخ ارتقا کا مبصر نقاد بیک نظر حقیقت کی تہ تک پہنچ جاتا ہے —

ابتدائی زمانے میں مسلمان عربوں اور اُن کی عیسائی رعایا کے مابین انتہائی یک جہتی پائی جاتی ہے - اہل عرب عیسائیوں کو اونچے سے اونچے انتظامی عہدے دیتے تھے اور اسلامی دنیا میں تمدن اور خیالات کی ایک بڑی رو آرہی تھی جس کا سرچشمہ ایشیا کا قدیم یونانی یہودی اور ایرانی تمدن تھا اور جس سے اسلام کی دینیات، مذہبی رسوم و تمدن کی ابتدائی سادہ حالت پر بہت کچھ اثر پڑ رہا تھا - حدیث مع اپنے لاکھوں روایات کے ثابت کرتی ہے کہ کیسی علمی تشنگی اور جذب و قبول کی بے ساختہ اشتہاے صادق اسلامی دنیا میں دوسری

صدی هجری کے اختتام تک طاری تھی —

تعصب، مغلق و مبہم خیالات، عیسائیوں کی مخالفت بالخصوص، اور آزاد خیالی کی مخالفت بالعموم، یہ اور اسی قسم کے تمام رجحانات عہد ما بعد میں محض متعدد سیاسی، تمدنی اور مذہبی وجوہ اور غیر عرب نو مسلم اقوام کے زبردست اثرات سے پیدا ہوئے —

مختصر یہ ہے کہ جو شخص اس عہد اور اس عجیب ایشیائی تمدن کی تاریخ سے صحیح طور پر واقف ہے وہ فوراً محسوس کر لیتا ہے کہ کتب خانۂ اسکندریہ کے برباد کرنے کی روایت بعید از قیاس اور لغو ہے اور یہ قصہ قرون اولیٰ کے عرب فاتحین کے حالات و واقعات کے قطعاً خلاف ہے —

اس نکتے کو سمجھ لینے اور اس متنازعہ مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر مختصر بحث کر لینے کے بعد اب مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ کسی مزید طوالت یا تضیع اوقات کو اس روایت کی تردید کے لئے اختیار کیا جائے۔ ہمارے خیال میں یہ ایک ایسا واہی اور لغو قصہ ہے جس کی نہ کوئی بنیاد ہے نہ حقیقت !

———:o:———

تتمہ

یحییٰ النحوی

ماخوذ از کائیانی تواریخ جلد ہفتم صفحہ ۱۳۹-۱۴۴)

یحییٰ النحوی کے متعلق مصنفین کے بیانات میں سخت ابتری پائی جاتی ہے، جس کو ایک حد تک ذیل میں رفع کرنے کی کوشش کی جاتی ہے :—

وہ یحییٰ جس کا عمرو بن العاص سے سابقہ پڑ سکتا ہے یحییٰ ساکن اسکندریہ طبیب و شارح کتب بقراط و جالینوس ہے (دیکھو تاریخ ادب بایزنطینی مصنفۂ

کروم باخرنمبر۶ صفحہ (۲۱۴-۲۱۷) Krumbacher, Geschibte der byzantinischen Letteratur, edizione 2 ei, page 614 e 617 No 6) وہ ساتویں صدی عیسوی میں زندہ تھا اور اس کی تصانیف سے عرب واقف ہوے اور انھوں نے اُن کا مطالعہ کیا۔ لیکن عربوں نے غلطی سے اس یحیی کے حالات کو اُس کے ہمنام اور ہم وطن عالم دینیات یحیی فیلویونو کے حالات میں مخلوط کردیا جس کا زمانۂ حیات پانچویں صدی عیسوی کے اخیر اور چھٹی صدی عیسوی کے شروع میں ہے اور "جو غراماطیقوس" (النحوی) کے نام سے مشہور ہے —

بہت سے حالات زندگی و نیز تصانیف جو یحیی طبیب کی جانب منسوب کردئے گئے ہیں فی الواقع یحیی النحوی سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً لفظ فیلویونو موخرالذکر کے نام ہی کا جزو ہے اور ابروقلس کے مسئلہ قدم عالم کی تردید میں جو ضخیم تصنیف ہے وہ بھی اُسی کی لکھی ہوی ہے۔ اِسی طرح تثلیث کے خلاف خیالات بھی یحیی النحوی ہی سے تعلق رکھتے ہیں اگرچہ وہ جلسہ جو اسکندریہ میں یحیی کی تکفیر کے لئے منعقد ہونا بتایا جاتا ہے، فرضی ہے —

ابن القفطی نے جو یہ لکھا ہے کہ یحیی کو " نامسطوس " بھی کہتے تھے صحیح نہیں ہے اور اس سے بھی زیادہ غلط ابن ابی اُصیبعہ کا وہ قول ہے جو اُسے مشہور وحدانی عالم یو طیخیوس Eutychius کی شخصیت سے مخلوط کرتا ہے —

تاریخی وجوہ سے یہ قطعاً ناممکن ہے کہ یحیی فیلو یونو کا عمرو بن العاص سے سابقہ پڑتا یحیی النحوی کے متعلق دیکھو حاجی خلیفہ جلداول صفحہ ۴۸۶ نمبر ۱۴۱۷ و جلددوم صفحہ ۵ نمبر ۲۰۶ و نمبر ۴ صفحہ ۹۷۰ سطر ۹) یہ بیان یحیی فیلویو نو سے تعلق رکھتا ہے، اینلق کس میں غلطی سے یحیی النحوی کو یحیی بن عدی کے نام کے ساتھ مخلوط کردیا گیا ہے - ابن ابی اصیبعہ جلد اول صفحہ ۱۰۳ و ۱۰۹، ای کلوک Leclerc تاریخ طب عرب جلد اول صفحہ ۴۳-۶۰ Medec. Arab. I, 43 - 60 ، Hist. اسٹائن شنائڈر (Steinschneider) " الفارابی " des Sciences de

Memoires del, AcademicImp. No 4 (1869) 111 و" الفہرست صفحہ ۶۵۴ - ۵۵۵ وانڈ کس الفہرست صفحہ ۲۷۱ - و رسالۃ المشرق بیروت سنہ ۱۹۱۳ نمبر صفحہ ۴۷ - ۵۷ مضمون نوشتۂ شیخو بعنوان "یحییٰ نحوی" وہ کون تھا اور کس زمانے میں تھا" وغیرہ وغیرہ)

یادِ نشاط

از

(جناب مولوی غلام طیب صاحب بی۔اے۔ بی ٹی عثمانیہ کالج اورنگ آباد)

چمکی بجلی' دل گھبرایا

یاد ابھی ہے دل میں تازہ   رونے پر آنکھیں آمادہ
غم کی بدلی خونیں بادہ   بہکی باتیں دل افتادہ

ہوا چلی اور میں گرمایا

نئے دلوں کا عہد الفت   بے سمجھے بوجھے کی چاہت
چہرے پہ سرخی دل میں ہمت   عیش کی مے اور لطف کی صحبت

کتنی جلدی پلٹی کایا

ہاتھوں میں کنگن زردی مائل   آنکھوں کے ڈورے سرخی مائل
باتیں دل کی گرمی مائل   ہنسنے ہنسانے پر جی مائل

کس نے چھیلی پیت کی مایا

باغ حسن کی وہ شادابی   گم گشتہ دل کی بے تابی
رنگ گلابی ساڑی آبی   چھوٹ رہی گھر میں مہتابی

آنکھ لڑی اور من لہرایا

وہ بھیگی برکھا کی راتیں   دبی ہنسی اور دھیمی باتیں
دل کے ہاتھوں عقل کی ماتیں   یوں ہی کٹ گئیں دو برساتیں

لیکن میں نے چین نہ پایا

من کی موج هری هریالی سر پر چھائی بدلی کالی
لطف میں جھومے پریم کی ڈالی سامنے صورت بھولی بھالی
جس نے سارے جگ کو بھلایا

آج وہ گھر کا نور کہاں ھے وہ چشم مخمور کہاں ھے
وہ جنت کی حور کہاں ھے اپنا اوج طور کہاں ھے
وہ جس نے دل کو تڑپایا

بے خود ھے یہ قلب مضطر کاش نہ ھوتا حسن کا خوگر
ٹوٹ گیا الفت کا ساغر خاک ھوے سب طبع کے جوھر
ثمرہ یہ اُلفت کا پایا

پھول وھی کھلتے ھیں چمن میں ھوا وھی ٹھنڈی گلشن میں
دنیا ساری اُسی برن میں لیکن آگ لگی ھے من میں
کس شعلہ نے دل کو جلایا

زخم دل کے پپیہا گھائل موج سمندر چاند پہ مائل
رند اُسی مے کا ھے سائل مجھ میں تجھ میں دنیا حائل
دل پہ اندھیرا سا ھے چھایا

غنچوں میں انداز نہیں وہ شاما کی آواز نہیں وہ
راگ وھی ھے ساز نہیں وہ ذھن کی اب پرواز نہیں وہ
غم نے تخیل کو جھلسایا

دل کی خوشی اب روح کا غم ھے اس پر جینا اور ستم ھے
پیار۔ محبت مثل سم ھے دل اپنا صرف ماتم ھے
روح کو فرقت نے پگھلایا

چھوٹ گئے تم رنج و تعب سے اس دنیا کی شور و شغب سے
خاموشی کی دھن تھی کب سے پاس ھو میرے دور ھو سب سے
جاں گنوائی تب سکھ پایا

زور پہ موجیں بہتا دریا لہروں میں اک دیا ہے جلتا
نظریں کرتیں اِس کا پیچھا دل ہے اُسی دئے میں اٹکا
عقل نے جس کا بھید نہ پایا

غم نے آنکھیں کھولیں میری غم سے پائی من نے دلیری
غم نے چھانٹی دل کی اندھیری اور بتھائی مورت تیری
غم کو میں نے امرت پایا

غم کے نقش نہ ہوں گر دل پر چمکے کیسے کندن بنکر
انسان رنج کا ہوکر خوگر ذرے سے بنتا ہے خاور
غم ہے عظمت کا سرمایا

'طیّب' بس یہ یاد بری ہے درد بھری فریاد بری ہے
دل پر یہ بیداد بری ہے جی کی یہ افتاد بری ہے
کس نے نہ کھویا - کس نے پایا

پیت کی بجلی دل میں چھپالے جس کو نہ پایا ابتک پالے
موت نہ ہرگز پردہ ڈالے ان کے بیچ جو ہیں دل والے
جس نے ڈھونڈا اُس نے پایا

مقدمۂ مثنوی خواب و خیال

سید محمدمیر نام، تخلص (اثر) کرتے تھے - خواجہ میر درد کے چھوٹے بھائی تھے - میر حسن اپنے "تذکرۂ شعرا" میں لکھتے ہیں:- "درویشے است موقر و صاحب سخنے است مؤثر، عالم و فاضل، رتبۂ قدرش بغایت بلند، گوہر صدرش نہایت ارجمند"- وہ خواجہ صاحب کے چھوٹے بھائی ہی نہیں تھے بلکہ اُن کے شاگرد اور مرید بھی تھے - اس مثنوی میں اُنہوں نے بھائی کا ذکر نہایت ادب اور عقیدت سے کیا ہے - درویشی اور شاعری دونوں میں اِنھیں کے قدم بقدم چلتے تھے اور اِس پر فخر کرتے تھے—

خواجہ میر درد اُن بزرگوں میں سے ہیں جو اپنی سیرت اور کلام کی وجہ سے ہمیشہ یاد رہیں گے - دلّی پر صدموں پر صدمے اور آفتوں پر آفتیں نازل ہوئیں مگر اُن کے پائے استقلال کو کبھی لغزش نہوئی - ایک وجہ تو بظاہر یہ تھی کہ بزرگوں کے وقت سے کچھہ جاگیر چلی آتی تھی اور لوگ اُن کی خدمت کو سعادت سمجھتے تھے، لیکن بڑی وجہ یہ ہے کہ اُن کی طبیعت میں حقیقی درویشی کی چاشنی تھی، توکل کے ساتھہ استغنا اور بے نیازی اُن کے خمیر میں تھی- انھوں نے کبھی امرا اور بادشاہوں کو منہ نہ لگایا - پاس وضع کا ہمیشہ خیال رکھا اور عمر بھر تک نبھایا - میر اثر نے بھی اپنے بھائی اور پیر و مرشد کی طرح، جن سے اُنھوں نے کسب کمال کیا تھا، "بطور درویشان صاحب معنی کے گوشہ نشینی اختیار کی"*

* گلشن ہند (صفحہ ۳۰) -

اور اپنے بھائی کے سجادے پر عمر بسر کر دی —

صاحب خمخانۂ جاوید لکھتے ھیں کہ " خواجہ میر درد کے عالم ضعیفی میں اُن کے ایک مرید نے عرض کی کہ دنیا دار فانی ھے اور حضرت کا وقت آخر، حضور ہدایت فرمائیں کہ آپ کے بعد کس کو آپ کا جانشین اور صاحب سجادہ مانیں۔ آپ یہ سنکر آنسو بھر لائے اور جواباً یہ قطعہ پڑھا :-

,,موت کیا ھم سے فقیروں سے تجھے لینا ھے — مرنے سے پہلے ھی یہ لوگ تو مر جاتے ھیں
تا قیامت نہیں مٹنے کے دل عالم سے — درد ھم اپنے عوض چھوڑے اثر جاتے ھیں" *

اس سے ظاھر ھے کہ خواجہ صاحب کو اپنے بھائی کا کس قدر خیال تھا اور وہ اُنھیں کیا سمجھتے تھے۔ اور میر اثر کے دل میں جو ادب و احترام اور ارادت و عقیدت مندی حضرت خواجہ صاحب کی طرف سے تھی، اُس کی کچھہ انتہا نہ تھی، چنانچہ اس کا ثبوت جا بجا اس مثنوی میں ملے گا اور اسی فیض صحبت کے اثر سے (اثر) کچھہ کے کچھہ ھو گئے —

درد ھی میرے جی میں چھایا ھے — درد کا میرے سر پہ سایا ھے

....

تو نے ایسی ھی دستگیری کی — پدری، مادری و پیری کی
تو نے اس مہر و غور سے پالا — نہ پڑا مجکو اور سے پالا
بات جو ھے مری سو تیرے ساتھ — تو نے ایسي ھی کی ھے میرے ساتھ
تو نے بندے کو یوں نوازا ھے — ایسے نا کس کو سرفرازا ھے

میر اثر کا کلام بہت ھی پاک، صاف اور فصیح ھے اور درد و اثر کی چاشنی رکھتا ھے اور مثنوی+ تو سلاست و فصاحت کی کان ھے۔ اُردو زبان میں مثنوی

---

* خمخانۂ جاوید جلد اول صفحہ ۱۲۶ —

+ اُن کے دیوان کی طرح اُن کی مثنوی بھی بہت کم یاب ھے۔ مجھے ایک مدت

(باقی بر صفحۂ آئندہ)

کا رواج بہت قدیم زمانے سے ہے اور دسویں صدی ہجری سے اب تک سینکڑوں مثنویاں لکھی گئی ہیں، جن میں عاشقانہ بھی ہیں، صوفیانہ بھی اور تاریخی بھی - بعض اُن میں سے بہت ضخیم اور بڑے پایۂ کی ہیں - لیکن اُس وقت اور اِس وقت کی زبان میں اس قدر تفاوت ہے کہ باہم کوئی مقابلہ نہیں ہو سکتا ۔ جدید اُردو زبان کی جب سے بنیاد پڑی ہے، شاید ہی کوئی مثنوی زبان کی سلاست اور روانی، فصاحت اور شیرینی، روز مرہ کی صفائی، قافیوں کی نشست اور مصرعوں کی برجستگی، زنانے اور مردانے محاوروں کے بے تکلف استعمال میں مثنویٔ ''خواب و خیال'' کا مقابلہ کرسکتی ہے - مگر بات کیا ہے کہ یہ کوئی مسلسل قصہ یا داستان نہیں ہے، ہجر و مفارقت، تمنائے ملاقات و مواصلت، راز و نیاز، چھیڑ چھاڑ، اور عشق و عاشقی کی کیفیات اور واردات کا بیان ہے اور بہت پر لطف ہے - لیکن ایک مسلسل داستان کے بیان میں جو مختلف اشخاص کی سیرت نگاری اور مختلف حالات و واقعات کے دکھانے میں شاعر کو مشکلات پڑتی ہیں اور جس سے اس کے کمال کا اندازہ ہوتا ہے، اُن سب چیزوں سے یہ مثنوی خالی ہے - یہی وجہ ہے کہ اگر چہ میر تقی میر کی مثنویاں صفائی زبان کے لحاظ سے اُسے نہیں پہنچتیں، لیکن جب اُن تمام امور کو پیش نظر رکھتے ہیں جو ایک مسلسل مثنوی کے لئے لازم ہیں تو میر صاحب کی مثنوی (شعلۂ عشق) کو نہ صرف بہ لحاظ زمانہ بلکہ ہر لحاظ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۶۸)

سے اس کی تلاش تھی، اتفاق سے اس کا ایک نسخہ میرے برادر معظم شیخ ضیاءالحق صاحب نے مجھے بھیجا جو انہیں کہیں سے مل گیا تھا - میں اس کی اصلاح و ترتیب میں مصروف تھا کہ مولوی نجیب اشرف صاحب ندوی نے اطلاع دی کہ انہیں ایک نسخہ انجمن اصلاح دیسنہ (بہار) کے کتب خانے میں دستیاب ہوا ہے اور جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ میں انجمن کی طرف سے اُسے شایع کرنے والا ہوں تو کمال عنایت سے وہ نسخہ میرے پاس بھیج دیا جس سے مجھے اپنے نسخے کی تصحیح میں بہت مدد ملی اور میں مولوی صاحب موصوف کا بہت شکر گذار ہوں —

سے تقدم اور فضیلت ہے - البتہ اس مثنوی میں دلی کیفیتوں اور معاملات عشقیہ کا بیان بہت قابل تعریف ہے اور خاصکر اس کا بے ساختہ اور بے تکلف طرز بیان بہت ہی لائق داد ہے اور حق یہ ہے کہ کمال کو پہنچا دیا ہے - جہاں سے کتاب کھولئے' ایک سی حالت ہے' یہاں معین ہونے کے لئے بعض مقامات سے بغیر کسی خاص کوشش کے چند شعر لکھے جاتے ہیں' جن سے (اثر) کے کلام کا انداز معلوم ہو گا:-

شادمانی نظر نہیں آتی — زندگانی نظر نہیں آتی
کیا کہوں میں کسو سے اپنا حال — زیست کرنی غرض ہوئی ہے محال
کون کس کی سنے ہے کس سے کہوں — اور الٹے ہنسے وو جس سے کہوں
درد کوئی کسو کا کیا جانے — اُس کا دل جانے یا خدا جانے
کیا کہوں کچھ کہا نہیں جاتا — چپ رہوں تو رہا نہیں جاتا
گر کہا بھی تو کون مانے ہے — جو سنے ہے سو جھوٹ جانے ہے
گر کسو نے سنا تو کیا حاصل — اور سے کب کھلے ہے عقدۂ دل
کوئی دم گر اکیلے پاؤں اُسے — درد دل تک ذرا سناؤں اُسے
دل کا شاید بخار نکلے جب — یہ جو کھٹکے ہے خار نکلے جب

غم کسو کے گھٹائے گھٹتا ہے — یا کسو کے مٹائے مٹتا ہے
جس کے جی پر پڑے وہی جانے — اور کے دل کی اور کب جانے

میں نے کردی ہے اب خبر تجھکو — مل نہ جاوے کہیں اثر تجھکو
تو خبردار ہو کہ ہووے گا — دیکھیو آپھی جو کہ ہووے گا
سب دنوں کا قصور نکلے گا — کیسا تیرا غرور نکلے گا
اُس کے ہاتھ اب کے بار آتو سہی — پھر سلامت تو بچ کے جا تو سہی
خیر وہ تو جو ہو گی سو ہوگی — اب تو مرتا ہے عشق کا روگی

اب نہ دن ہی کٹے نہ رات کٹے   کس طرح عرصۂ حیات کٹے
رات کاٹے کوئی کہ دن کاٹے   بات بنتی نہیں ہے بن کاٹے
عمر یوں کاٹے کس کو بھاتا ہے   تس پہ دن رات کاٹے کھاتا ہے
ہے شب ماہ دل پہ یوں پیارے   جیسے گھوڑے کو چاندنی مارے

جس کے آنے کا لگ رہا ہے خیال   روز در پیش ہے یہی جنجال
گر کبھی رہ دو چار ہو جاوے   پھر سر نو بہار ہو جاوے

دانتوں کی تعریف میں :—

یوں تو کہنے کو جیسے موتی ہیں   باتیں موتی میں کب یہ ہوتی ہیں
گو سزاوار آب دار موتی ہے   یہ صفا کوئی اس میں ہوتی ہے

اپنی حیرت میں ایک لوگوں میں   تس پہ حیران لوگ کرتے ہیں
میری تیری بات یہ کہتے ہیں   کچھ کچھ آپس میں بیٹھے بکتے ہیں
کوئی ادھر کو دھیان رکھتا ہے   کوئی باتوں پہ کان رکھتا ہے
کوئی آپس میں آنکھ مارے ہے   کوئی چپ در پئے اشارے ہے
کوئی پکڑے ہے منہ کی بات کہی   کوئی کہتا ہے دیکھ، رہ تو سہی
کوئی پھینکے ہے بیٹھا آوازے   کہ یہ کھینچیں گے اس کے خمیازے
کوئی حیران بن کے بیٹھے ہے   کوئی انجان بن کے بیٹھے ہے
کوئی آنکھیں ادھر کو گاڑے ہے   کوئی نظریں چرائے تاڑے ہے
کوئی چتون کو اب پرکھتا ہے   کوئی تیوری پہ دھیان رکھتا ہے
ہر کوئی ہے اسی کے اب درپے   کہ بھلا دیکھوں بات یہ کیا ہے

....

اب کہاں تجھ کو دیکھ سکتا ہوں   بیٹھا اوروں کے منہ کو تکتا ہوں

تجھہ کو دیکھوں کہ آہ اِن کی سنوں　　سبھی دشمن ہیں کسکو دوست کہوں

....

پہلے سو بار اِدھر اُدھر دیکھا　　تب تجھے تر کے یک نظر دیکھا
نہیں معلوم کیا کیا اِن کا　　هم غریبوں نے کیا لیا اِن کا

کس لئے اس قدر تو ڈرتا ھے　　سب سے یوں سہم کر بگڑتا ھے
ٹک سمجھہ تو کسو کا چور نہیں　　تیرے اوپر کسو کا زور نہیں
مجھہ سے نظریں جو تو چراتا ھے　　چور اپنے تئیں گنا تا ھے
یا کہ دزدیدہ میں جو دیکھوں ھوں　　کبھی پوشیدہ میں جو دیکھوں ھوں
چور ھیں ھم نہ چور کے ساتھی　　بات اب کیا ھے پیشتر کیا تھی
اپنے اوپر کریں ھیں سب کو قیاس　　ھم تو اِن باتوں کے نہ آس نہ پاس
تو جو ملنے سے جی چھپاتا ھے　　آنکھہ کُھل کر نہیں ملاتا ھے
خلق اس سے کچھہ اور سمجھے ھے　　ھاں برائی کے طور سمجھے ھے
واہ یہ بات کا چھپانا ھے　　یا کہ اور آپ خود جتانا ھے
اِس پہ لوگوں نے زور ٹھیرایا　　ھمیں آپس میں چور ٹھیرایا
یہ بہ تکرار آزمایا ھے　　بارھا دیکھنے میں آیا ھے
جس قدر بات کو چھپاتے ھیں　　لوگ اتنا ھی صاف پاتے ھیں
دیکھہ میری طرف تو اب نہ دھڑک　　ساتھہ مل بیٹھہ اس قدر نہ بھڑک
پھر جو بولے کوئی تو میں جانوں　　بات کھولے کوئی تو میں جانوں

لوگ تیرے جو پاس آتے ھیں　　سن کے میرے حواس جاتے ھیں
ھوش اُن کے ٹھکانے رھتے ھیں　　تیری سنتے ھیں اپنی کہتے ھیں
میں جو تجھہ سے دوچار ھوتا ھوں　　پھر تو بے اختیار ھوتا ھوں

جس گھڑی تیرے پاس جاتا ھوں — بس لپٹ بے حواس جاتا ھوں
سارے منصوبے بھول جاتے ھیں — ھاتھہ پانو اپنے پھول جاتے ھیں
منہ کو حسرت سے دیکھہ رھتا ھوں — پھر نہ سنتا ھوں کچھہ نہ کہتا ھوں
بات کہنی تھی اور نکلی اور — بے حواسی تک ایک کرنا غور
جب بجاے خود اپنے آتا ھوں — دل کو ذرّا ٹھکانے لاتا ھوں
جی میں کہتا ھوں کھاکے پچھتا ے — اب کے یہ یہ کہوں جو مل جاوے
بارھا اس کو آزمایا ھے — یہی حال خراب پایا ھے

ھجر میں جی ھے میرے پاس کہاں — وصل میں گر جیا حواس کہاں

اِن واردات قلبی کے علاوہ (اثر) نے ایک سراپا بھی لکھا ھے جسکے تقریباً تین سو شعر ھوں گے۔ سراپا ھماری شاعری میں ایک پامال مضمون ھے اور اُس کی تشبیہیں اور استعارے اس قسم کے ھیں کہ بعض اوقات مضمون مضحکہ خیز ھو جاتا ھے، تاھم اُنھوں نے اِس میں خوب خوب شعر نکالے ھیں۔ سراپا کے لئے زیادہ تر فارسی تشبیہیں استعمال کی جاتی ھیں مگر میر (اثر) نے کہیں کہیں ھندی تشبیہوں سے بھی کام لیا ھے۔ مثال کے لئے یہ شعر ملاحظہ ھوں :-

کہی جاتی نہیں کمر کی لچک — پائی چیتے نے کب یہ ایسی اپک
یوں سیہ مست جھولے آتے ھیں — مست جوں ھاتھی ھولے آتے ھیں
مانگ موتی بھری وہ دے ھے بہار — جیسے بگلوں کی بدلی میں ھو قطار

سراپا میں کوئی عضو نہیں چھوڑا اور اِس دھن میں وہ حد سے آگے نکل گئے ھیں —

اس سے بڑھ کر میر صاحب نے اختلاط کے موقعے کی جو باتیں لکھی ھیں، اُس میں تو خوب کُھل کھیلے ھیں اور پردہ بالکل اُٹھا دیا ھے۔ مولانا حالی مرحوم کی

نظر سے یہ مثنوی نہیں گزری تھی، اس کے متعلق بعض احباب سے سنا تھا اور ایک دو شعر خود اُنھیں یاد تھے، اس پر سے انھوں نے یہ قیاس ظاہر کیا ھے کہ شوق نے اپنی مثنویوں کی بنیاد میر اثر ھی کی مثنوی پر رکھی ھے اور مثالاً ایک شعر بھی لکھا ھے جو شوق کے ھاں صرف ایک لفظ کے ادل بدل سے بجنسہ موجود ھے - چنانچہ وہ اپنے " مقدمۂ شعر و شاعری " میں لکھتے ھیں:-

" یہ بات تعجب سے خالی نہیں کہ نواب مرزا شوق کو اپنے اسکول کے برخلاف مثنوی میں ایسے صاف اور با محاورہ زبان برتنے کا خیال کیوں کر پیدا ھوا کیونکہ جب سوسائٹی کا رخ دوسری طرف پھرا ھوا ھوتا ھے تو اُس کے مخالف رخ بدلنے کے لئے کسی خارجی تحریک کا ھونا ضروری ھے - ظاھرا ایسا معلوم ھوتا ھے کہ خواجہ میر درد کے چھوٹے بھائی خواجہ میر اثر دھلوی نے جو مثنوی لکھی ھے جس کا نام " خواب و خیال " رکھا تھا اور جس کی شہرت ایک خاص وجہ سے زیادہ تر پورب میں ھوئی تھی، اُس مثنوی میں جیسا کہ ھم نے اپنے بعض احباب سے سنا ھے تقریباً ۴۰-۳۵ شعر اسی قسم کے ھیں جیسے کہ شوق نے " بہارعشق" میں اختلاط کے موقع پر اُن سے بہت زیادہ لکھے ھیں - معلوم ھوتا ھے کہ شوق کو ایسی صاف زبان برتنے کا خیال اُس مثنوی کو دیکھہ کر پیدا ھوا - اور چونکہ وہ ایک شوخ طبع آدمی تھا اور بیگمات کے محاورات پر بھی اُس کو زیادہ عبور تھا، اُس نے اپنی مثنوی کی بنیاد " خواب و خیال " کے اُنھیں ۴۰-۳۵ شعروں پر رکھی اور اُن معاملات کو جو خواجہ میر اثر کے ھاں ضمناً مختصر طور پر بیان ھوے تھے، اپنی مثنوی میں بہت وسعت کے ساتھہ بیان کیا اور جس قسم کے محاوروں کی اُنھوں نے بنیاد قایم کی تھی، شوق نے اس پر ایک عمارت چن دی - اس کا بڑا ثبوت یہ ھے کہ " خواب و خیال " کے اکثر مصرعے اور شعر تھوڑے تھوڑے تفاوت سے " بہار عشق " میں موجود ھیں"—

جب گلشن ھند چھپی، جس میں اثر کا بھی تذکرہ ھے، تو اس میں چند اشعار

اِس مثنوی کے بھی نظر آے - اتفاق سے صاحب تذکرہ نے سراپا کے بعض معمولی شعر نقل کر دئیے ھیں جن سے اس مثنوي کی خوبی کا اندازہ نہیں ھوسکتا - ان اشعار کو دیکھہ کر مولانا شبلی مرحوم نے تذکرے کے حاشیے پر یہ خیال ظاھر فرمایا ھے :—

"مولوي حالی صاحب نے اپنے دیوان کے مقدمے میں لکھنؤ کی شاعری میں صرف نواب مرزا شوق کی مثنویوں کا اعتراف کیا ھے' لیکن چونکہ اُن کے نزدیک شعراے لکھنؤ سے ایسی فصاحت اور سلاست کی توقع نہیں ھوسکتی' اس لئیے اِس کی وجہ یہ قرار دي کہ نواب مرزا نے خواجہ میر اثر کی مثنوی دیکھی تھی اور اُس کا طرز اُڑایا تھا' یہ اشعار اُسی مثنوی کے ھیں - اس کا فیصلہ خود ناظرین کرسکتے ھیں کہ یہ مثنوی نواب مرزا کا ماخذ اور نمونہ ھو سکتی ھے"—

اب جو یہ مثنوی ھمارے سامنے موجود ہے تو ھم بلا شبہ یہ کہہ سکتے ھیں کہ یہ مثنوی نواب مرزا کا ماخذ اور نمونہ ہے اور اس سے یہ معلوم ھوتا ھے کہ مولانا حالي کا قیاس کس قدر صحیح تھا - اس خاص موقع کے چند شعر دونوں مثنویوں سے نقل کئے جاتے ھیں :—

خواب و خیال	بہار عشق
هاتھا پائی میں ھانپتے جانا	ھاتھا پائی میں ھانپتے جانا
کُھلتے جانے میں ڈھانپتے جانا	چھوتے پردوں کو ڈھانپتے جانا
ھولے ھولے پکارنے لگنا	چپکے چپکے پکارتی تھی کبھی
ڈھیلے ھاتھوں سے مارنے لگنا	ڈھیلے ھاتھوں سے مارتی تھی کبھی
وہ ترا پیار سے لپٹ جانا	کھول کر دل چمٹ چمٹ کے ملا
اور دل کھول کے چمٹ جانا	کیسا کیسا لپٹ لپٹ کے ملا
وہ ترا منہ سے منہ بھڑا دینا	کبھی منہ سے دیا چپا کر پان
وہ ترا جیب کا لڑا دینا	کبھی مل کر لڑی زباں سے زبان

اگر دونوں مثنویوں کے اس قسم کے اشعار برابر برابر رکھ کر پڑھے جائیں تو صاف معلوم ہوجائیگا کہ مرزا شوق نے "خواب و خیال" ہی کو اپنانمونہ بنا یا اور اسی مثنوی پر سے انھیں اِس قسم کی زبان لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ کیونکہ شوق کے زمانے میں لکھنؤ میں شاعری الفاظ کا گورکھ دھندا ہوکے رہ گئی تھی اور تصنع اور تکلف انتہا درجے کو پہنچ گیا تھا۔

لفظی رعایت بھی کہیں کہیں نظر آتی ہے مگر بہت کم اور وہ بھی زیادہ تر سرا پا ہی میں پائی جاتی ہے۔

میر اثر بزرگ اور بزرگ زادے تھے۔ درویشی اُن کا شعار تھا۔ اس لئے تعجب ہوتا ہے کہ انھوں نے بعض مقامات پر ایسی کُھلی کُھلی باتیں کیونکر لکھدیں۔ مثنوی کے شروع میں اُنھوں نے خود اس کا ذکر کیا ہے۔ عشق کا ذکر کرتے کرتے فرماتے ہیں :—

الغرض آگیا تھا ذکرِ مجاز تس پہ جھولا ہے اس کا راز و نیاز
عشق صوری کی اس میں ہیں حالات اور اس راہ کی ہیں کیفیات
حال ہے مبتلائے رسوا کا وصف ہے یار کے سرا پا کا
ہر کسو کی نہیں شبیہ و مثال ہے یہ تصویر از قبیلِ خیال

اگرچہ یہ تصویر خیالی ہے مگر کس قدر سچی ہے۔ اس کے بعد کہتے ہیں :—

ظاہر گفتگو بہانہ ہے توسنِ دل کو تازیانہ ہے
بہر یاران شوخ طبع جواں نکتہ رس شعر فہم ریختہ خواں
ایک بھی طرح یہ نکالی ہے بات کی طرز کچھ نرالی ہے
نالہ افسردگی سے گر مارین گھڑی چھوڑ راہ پر آویں
کچھ نصیحت نہ واعظانہ ہے بلکہ یہ پند عارفانہ ہے

اور اس طور پر نصیحت کرنے کی وجہ بتائی ہے کہ :—

عشق کی حالتوں کو زبنہ کریں سارے خطروں سے پاک سینہ کریں

دل جلوں کا ھے دل کی لاگ علاج — آگ کے جوں جلے کا آگ علاج

مگر اِن معاملات میں یہ علاج اکثر کارگر نہیں ہوتا بلکہ مخالف پڑتا ھے۔ آگے چل کر بطور معذرت کچھ کہتے ھیں اور اپنی صفائی کرتے ھیں:—

پڑ گیا اِس میں یوں سخن کا رنگ — ھیں مضامین بہت شوخ و شنگ
بےطرح گرچہ لغویات یہ ھے — پر خدا جانتا ھے بات ھے یہ
کام مجکو کسی کے ساتھہ نہیں — یہ سرشتہ ھی میرے ھاتھہ نہیں
چھپی رہتی نہیں کسی کی معاش — نظر آتی ھے سب کی بود و باش
میں کہاں اور یہ خیال کہاں — ھجر کس کا (اور) وصال کہاں

....

بات میں بات کچھہ نکل آئی — ہو گئی یوں ھی طبع آرائی
وضع اس کی ہوئی خلاف طبع — ھے مجھے اس سے انحراف طبع
نہ کہوں عہد ؟) ھے گر اُس کو تمام — لغو، بیہودہ، ھیچ، پوچ کلام
کچھہ سردست ہنستے ہنستے کہا — بعض یاروں کو سن کے یاد رہا
نہ کیا اس کو داخل دیوان — نہیں یہ نظم شامل دیوان
آزمانا تھا کچھہ روانی طبع — کچھہ دکھانا تھا نوجوانی طبع
ایک دو دن میں کہہ کے پھینک دیا — نہیں معلوم کن نیں اُس کو لیا
اب جو دیکھو کسی کے پاس کہیں — ھیں یہ اُس کے ھی شعر میرے نہیں

باوجود ان سب باتوں کے فرماتے ھیں کہ جو لوگ سخن فہم اور ذوق شعر رکھتے ھیں اور جن کے دل میں سوز و گداز ھے اور راز و نیاز کی گھاتوں سے واقف ھیں:—

لطف سب بات کا وہ پاویں گے — جی میں خطرہ برا نہ لاویں گے
ورنہ بے درد اِس کو کیا جانے — اور دل سرد اِس کو کیا جانے
سب یہ بے درد نکتہ چیں ھیں گے — قابل گفتگو نہیں ھیں گے

اگرچہ اس مثنوی میں ایک آدہ مقام ایسا آگیا ھے جہاں حیا اور شرم کو

بالائے طاق رکھہ دیا ہے، مگر میر اثر کی زندگی ایسی پاک صاف اور درویشانہ تھی کہ اُن پر کسی کا وہ گمان نہیں ہوسکتا جو شوق کی مثنویاں پڑہ کر ہوتا ہے یہاں صرف گنتی کے چند شعر ہیں اور وہاں دفتر کا دفتر اسی سے سیاہ کیا ہے۔ لیکن اِس میں کچھہ شک نہیں کہ مثنوی میں اِس سلاست و فصاحت کے بانی میر اثر ہی ہیں اور خود فرماتے ہیں:

نظم کی طرح یہ نرالی ہے   طرز اس کی نئی نکالی ہے

اِس مثنوی کی وجہ تصنیف یہ بیان کی ہے کہ ایک بار خواجہ میر درد نے مثنوی کے طور پر از راہ تفنن کوئی سو شعر کہہ ڈالے، وہ میں نے مانگ لئے اور وہی اشعار اِس مثنوی کی بنا قرار پائے۔ اگرچہ ہے تو یہ مثنوی مگر کہیں کہیں خود اپنی اور خواجہ میر درد کی اردو فارسی غزلیں جو مثنوی کی بحر میں ہیں، موقع موقع سے آگئی ہیں۔ علاوہ اس کے مثنوی میں بھی خواجہ میر درد کے اشعار ہیں یعنی سو فارسی اور سو ہندی (اردو) اور سو مثنوی کے، کل تین سو—

بعض بعض جگہ ایسے لفظ آتے ہیں جو اب بول چال میں نہیں ہیں۔ مثلاً مشغولا، پھر مانا (پھرسے)، دست (بمعنی چیز) ملنا (بہ فتح ہ)، دوکھنا (دوس)، الزام، رنڈی (بمعنی عورت)، کب لگ (کب تک)، دمنا (چمکنا)، مزاخ (مزاح، مذاق)۔ مگر آگو، پیچھو، کد، جد، دربار ایسے لفظ ہیں، جو اب بھی عوام کی زبان پر ہیں—

رسم خط ہم نے وہی رکھا ہے جو اُس وقت رائج تھا اور پرانے نسخے میں لکھا تھا۔ مثلاً 'نے' کو 'نیں'، 'متارے' کو 'میتاوے'—

اگر چند الفاظ کا خیال نہ کیا جائے جو اب متروک ہیں تو مثنوی کی زبان ایسی پاک صاف اور شستہ، بول چال ایسی بےساختہ ہے کہ اُس وقت کی اور آج کل کی بول چال میں کچھہ فرق نہیں معلوم ہوتا۔ صفائی اور بھی زیادہ اس وجہ سے معلوم ہوتی ہے کہ اس میں وہ فارسی ترکیبیں نہیں پائی جاتیں جو میر اثر کے ہم عصر

شعرا کے کلام میں نظر آتی ھیں—

افسوس ھے کہ میر اثر کا دیوان اب تک ھمیں دستیاب نہیں ھوا لیکن اِس مثنوی میں جا بجا اُن کی غزلیں آگئی ھیں اور اُن کے دیکھنے سے معلوم ھوتا ھے کہ غزل میں بھی اُن کا وھی رنگ ھے، اور سادگی اور کلام کی صفائی کے ساتھہ درد و اثر بھی ویسا ھی پایا جاتا ھے—

بادۂ کہن

(میر حسن)

میر حسن سے کون واقف نہیں۔ اُن کی مثنوی نے وہ قبولیت حاصل کی کہ شاید ہی اُردو میں کسی کے کلام کو حاصل ہوئی ہو۔ اب تک وہ اسی ذوق و شوق سے پڑھی جاتی ہے اور جب تک اُردو زبان ہے اس کی قدر کم نہ ہوگی۔ انجمن ترقی اُردو نے میر صاحب کا کلیات مرتب کیا ہے اور بعد تصحیح شائع کیا جائے گا۔ یہاں کچھ نمونہ اُن کے کلام کا دیا جاتا ہے:—

غزل

کیا مغرور اس کو آپ اپنا حال کہہ کہہ کر
مجھے آتا ہے غصہ اپنی نادانی پہ رہ رہ کر

یہ کس بد مست کی ٹھوکر سے لذت اُس نے پائی ہے
پڑا ہنستا ہے کچھ جس کی کیفیت سے قہہ قہہ کر

مثل مشہور ہے "خود کردہ را درماں نمی باشد"
کیا ظالم تجھے ہم نے ہی تیرا ظلم سہہ سہہ کر

گریباں چاک کر حسرت سے تک رہتا ہوں میں اس کو
کسی کا جب کوئی دامن کہیں کھینچے ہے کہہ کہہ کر

خزاں جب ہوگی تب ہوگی ابھی سے فکر کیا اس کی
چمن میں بیٹھ کر بلبل کوئی دم پھر تو چہ چہ کر

ہنسے گل کیوں نہ کھل کھل کر بھلا اس سے وہ بیجا پر
کہ کھلنے کے لئے غنچہ ورق رکھتا ہے تہ تہ کر

مہ نو کو دکھاتا ہے کوئی جیسے اشارے سے
ہمارا دل ترے ابرو کو دکھلاتا ہے وہ وہ کر

گیا تھا بھول سب کچھ میں تو بلگلے کی جدائی میں
غزل یہ مجھ سے کہوائی احسن دوستوں نے کہہ کہہ کر

میں کہا مجھ سے ملا کر تو لگا کہنے اوہوں
پھر کہا کچھ تو وفا کر تو لگا کہنے اوہوں

میں کہا پھر نہیں تجھ میں تو بولا وہ کہ ہوں
جب کہا رحم کیا کر تو لگا کہنے اوہوں

میں کہا دل سے مری جان کبھی تو مہرا
کچھ تو احوال سنا کر تو لگا کہنے اوہوں

سب سے ملتا ہی تھا کر دیکھ کے دن میں نے کہا
مجھ سے بھی مل تو ٹک آکر تو لگا کہنے اوہوں

میں کہا تجھ سے نہ بولوں میں تو کہنے لگا ہوں
بیٹھا جب ملہ میں بلا کر تو لگا کہنے اوہوں

جب کہا مرتا ہوں تو کہنے لگا مر
پھر کہا میں کہ دعا کر تو لگا کہنے اوہوں

جب کہا میں کہ اوہوں ہی رہے یا کہ ہو ہوں
کچھ یہ قصہ تو ادا کر تو لگا کہنے اوہوں

میں کہا دل کو اُٹھالوں ترے در سے کہا ہوں
لے چلا جب میں اُٹھا کر تو لگا کہنے اوہوں

میں (حسن) سے جو کہا اُس کی تو باتیں ہیں یہی
مل نہ اب اُس سے تو جا کر تو لگا کہنے اوہوں

یہ طرفہ تر کہ تیری سنبھلتی نہیں زباں
اور تیرے سامنے مری چلتی نہیں زباں

میرا تو دل جلا تری باتوں سے شمع رو
تو بھی تو دیکھ کیا تری جلتی نہیں زباں

کس منہ سے وصف تیری میں لکنت کا اب کروں
حیرت سے میرے منہ میں تو ہلتی نہیں زباں

ایک ایک شعر میرا جواہر کا ہے رقم
کیا کیا سخن کے لعل اُگلتی نہیں زباں

جو گفتگو ہے تیری سو ہے پھر میں کیا کروں
اپنی تو بات سے مری ٹلتی نہیں زباں

کل عہد کچھ کیا تھا دیا قول آج کچھ
پھر کہئے تو کہ میری بدلتی نہیں زباں

سرگرم سوز عشق رہے ہے یہ مثل شمع
تس گھل گیا ہے اور پگھلتی نہیں زباں

جو طرح سے میں کرتا ہوں تقریر پر (حسن)
مجھ سے حال دل کے نکلتی نہیں زباں

رباعیات

نہ مے کے نہ جام کے لئے مرتے ہیں   نہ دھر میں نام کے لئے مرتے ہیں
منشا یہ کہ بعد مرگ پوچھیں وہ ہمیں   بس ہم اس کام کے لئے مرتے ہیں

آباد رہے تو کیا ہوا دنیا میں   برباد رہے تو کیا ہوا دنیا میں
وارستہ ہوے نہ قید ہستی سے احسن   آزاد ہوے تو کیا ہوا دنیا میں

جب ہاتھ میں ساقی کے گلابی ہوگی   اور چشم سیہ مست شرابی ہوگی
تب عقل و خرد پہ کیا بلا آوے گی   اور ہوش کے سر پہ کیا خرابی ہوگی

تبصرے

ادب

مرآة الشعر ۶۸۷
شعر الہند (حصۂ دوم) ۶۸۸
براؤننگ ۶۸۹
اقبال ۶۹۱
صبح وطن ۶۹۳
محاکمۂ قطعات ابن یمین و سعدی
مع سوانح ابن یمین ۶۹۳
مرزا عبدالرحیم خانخاناں کی دوہاولی ۶۹۴
عقوبت گناہ ۶۹۴
اصلاح سخن ۶۹۵

تعلیم

التربیة الاستقلالیه ۶۹۷
فطرت اطفال ۶۹۹
تمرینات النحو ۷۰۰

تاریخ

بدھ اور اُس کا مت ۷۰۱
یاد ایام (اعلیٰ) تاریخ گجرات ۷۰۲

مذہب

خطبات مدراس ۷۰۳
خورشید صداقت ۷۰۳

متفرق

مذاکرات (سال اول) ۷۰۴
نظریۂ اضافیت ۷۰۶
زراعت عملی (حصۂ اول) ۷۱۱
فن پولٹری فارمنگ ۷۱۲
عربی طب پر ایک لکچر ۷۱۲
خطبۂ صدارت ۷۱۳
رپوٹ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل
کانفرنس بابتہ سنہ ۱۹۲۵ع ۷۱۴
نقشۂ مقامات مقدسہ و عالم اسلام ۷۱۴

اُردو کے جدید رسالے

آفتاب ۷۱۵
ادبستان ۷۱۶
تحفہ ۷۱۶
زبان ۷۱۷
کائنات ۷۱۷
مرقع ادب ۷۱۷
مصلح ۷۱۸
تجارت ۷۱۸

ادب

مراۃ الشعر

(مولفہ مولوی عبدالرحمن صاحب - صدر شعبۂ عربی، فارسی، اردو، دہلی یونیورسٹی
قیمت تین روپیہ)

فاضل مولف نے سنہ ۱۹۲۳ ع میں عربی شعر پر کچھ زائد یونیورسٹی لکچر دیے تھے، احباب کے اصرار سے اب کتاب کی صورت میں شایع کئے گئے ہیں۔ البتہ عربی کے ساتھ فارسی، اردو کی مثالیں بھی اضافہ کردی گئی ہیں اور اس طرح یہ کتاب فارسی اور اردو دانوں کے لئے بھی مفید ہوگئی ہے۔ عربی اشعار کا ترجمہ بہت سلیس اور شستہ زبان میں کیا ہے —

قابل مولف نے، جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں، "مشرقی شاعری اور اُس کی صناعت کو مشرقی نگاہ سے دیکھنے دکھانے کی کوشش کی ہے تاکہ چیز اپنے اصلی رنگ روپ میں نظر آے"۔ اس کوشش میں اُنھیں بہت کچھ کامیابی ہوئی ہے۔ لیکن مغربی اصول سے وہ بہت بچتے اور گھبراتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ "جو حضرات عربی، فارسی، اردو کی قدیم شاعری کو مغربی پوئٹری کے پیمانے سے ناپنا چاہتے ہیں، وہ نہیں سوچتے کہ جب تک مشرق و مغرب ایک نہ ہوجائیں، اِن کی اصطلاحات اور مصداق اصطلاحات کو بھی ایک ترازو میں نہیں تولا جاسکتا"۔ یہ ضرور نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہر ملک کی شاعری میں مقامی رنگ ہوتا ہے۔ اور ایک ملک کی شاعری میں دوسرے ملک کی شاعری سے صاف فرق نظر آتا ہے، لیکن شعر کا حسن ہر جگہ یکساں ہے۔ اصول تنقید، مغرب کے ہوں یا مشرق کے، کچھ فرق و امتیاز نہیں رکھتے۔ دیکھنا یہ ہے کہ صحیح معیار قائم کرنے میں کون زیادہ کارآمد ہیں —

کتاب کا پہلا باب شعر پر ہے، جس میں شعر کی تعریف، وزن، قافیہ، شعر کے آغاز

وغیرہ پر بحث ہے۔ اس کے بعد الفاظ، مجاز، معانی، خیال، تخیل، تمثیل، جدت ادا فکر، وصف، حسن ادا پر متعدد ابواب ہیں۔ ان مضامین کی تقسیم در تقسیم میں بہت کھینچ تان سے کام لیا ہے اور بعض وقت طبیعت اُکتانے لگتی ہے۔ شاید اسی وجہ سے کتاب کا شروع سے آخر تک مسلسل پڑھنا دشوار معلوم ہوتا ہے۔ شعر کے ظاہر سے زیادہ بحث کی ہے، باطن سے کم۔ ان تقسیموں میں بہت سی باتوں کا اعادہ ضرور ہوگیا ہے اور اکثر فرق اس قدر کم رہ گیا ہے کہ کتاب پڑھنے کے بعد ٹھیک یہ نہیں معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے کونسی نئی چیز حاصل کی۔ لیکن بیان بہت صاف، رواں اور بے تکلف ہے اور جو کچھ بیان کیا گیا ہے، بہت صفائی کے ساتھ، صاف ستھری زبان میں ادا کیا گیا ہے اردو زبان میں اس قسم کی کتابیں بہت کم ہیں اور اس لئے ہم اس کی قدر کرتے ہیں اور ہمارا خیال ہے کہ اس سے اردو زبان کے ذخیرے میں ضرور کچھ اضافہ ہوا ہے —

شعر الہند [حصۂ دوم]

(از مولانا عبدالسلام ندوی صاحب۔ صفحات ۴۵۹، قیمت چار روپئے۔ دار المصنفین اعظم گڈھ)—

اس کتاب کا پہلا حصہ گزشتہ سال طبع ہوا تھا اور اس پر تبصرہ ہوچکا ہے۔ یہ دوسرا حصہ ہے۔ اس میں تاریخی اور ادبی حیثیت سے اردو کی انواع شاعری پر بحث کی گئی ہے۔ جس سے مطلب غزل، ریختی، واسوخت، قصیدہ، مرثیہ، مثنوی، ڈراما، مذہبی، صوفیانہ، اخلاقی اور فلسفیانہ شاعری ہے۔ تاریخی حصہ ۲۸۱ تک ہے او ادبی بحث ۲۸۲ سے ۴۵۹ تک۔ ادبی بحث میں علاوہ اوپر کی انواع کے ضمنی طور پر خمریات، ہجو، سہرا، وصف، تشبیہ و استعارہ، اجزائے شعر (قافیہ، ردیف، وزن) محسنات شعر (صنائع و بدائع) کا ذکر آ گیا ہے، لیکن یہ سب اجمال کے ساتھ ہے غالباً اس لئے کہ ان میں سے اکثر پر مستقل کتابیں موجود ہیں۔ تیسرے باب میں مختصر طور پر ملکی سرمایہ، ہندوؤں کا تعلق اردو شاعری کے ساتھ اور مربیان سخن پر بحث ہے۔ خاتمے میں اردو شاعری کا درجہ بتایا گیا ہے —

اردو کی شاعری کی انواع قریب قریب وہی ہیں جو فارسی شاعری کی، اس لئے اُن پر کچھ زیادہ تفصیل سے بحث کی ضرورت نہیں رہتی، البتہ تاریخی لحاظ سے تحقیق کی

گنجائش بہت کچھ ہے - فاضل مؤلف نے جہاں تک ان کی دسترس تھی' دونوں پہلوؤں پر بخوبی بحث کی ہے - اور تحقیق کی داد دی ہے - تاہم بعض عنوان کسی قدر تشنہ رہ گئے ہیں - جوں جوں قدیم چیزیں دستیاب ہوتی جائیں گی ' تحقیق کا میدان وسیع ہوتا جائیگا - ہر عنوان کے تحت میں شعرا کے کلام سے نمونے کے اشعار کافی دیے گئے ہیں اور ہر عنوان کا تجزیہ بڑی خوبی سے کیا گیا ہے اور اس کی ساری کیفیتیں کلام کے نمونے کے ساتھ بتائی گئی ہیں —

یہ کتاب اردو شاعری پر بہت قابل قدر ہے ' خصوصاً اس وجہ سے بھی کہ قابل مولف نے ہر پہلو کا موازنہ نہایت انصاف اور سچائی سے کیا ہے اور روایتی تعصبات اور رسمی خیالات کی مطلق پروا نہیں کی ہے —

براؤننگ

براؤننگ (۱۸۱۲ - ۱۸۸۹) انگریزی شعرا کی صف میں ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے - معانی ' اسلوب بیان ' جدت ادا ' نحوی پیچیدگیاں — غرض کہ ہر حیثیت سے اسکی نظمیں دوسرے شاعروں کے کلام سے الگ نظر آتی ہیں - دقت پسند بھی بلا کا ہے - گہرے مطالب ادا کرتا ہے ' اور صرف و نحو کی زنجیروں کو دماغ کی جولانی میں حائل ہونے نہیں دیتا - سید وقار احمد صاحب بی - اے (عثمانیہ) نے مذکورۂ بالا عنوان سے اس کی ایک مشہور نظم ربی بن عذرا کا اردو میں ترجمہ فرمایا ہے - ' اس نظم میں بڑھاپے اور جوانی کا مقابلہ کیا گیا ہے اور اول الذکر کی فوقیت ثابت کی گئی ہے —

کتاب چار حصوں میں تقسیم کی گئی ہے - شروع کے ۱۳ صفحوں میں حیدرآباد کے مختلف مشاہیر کی رائیں درج ہیں ' مجیب احمد صاحب تمنائی نے فاضل مترجم کا تعارف کرایا ہے ' اسکے بعد خود مترجم کی طرف سے چار صفحے کا دیباچہ ہے - اسمیں شک نہیں کہ اردو کتابوں میں رائیں درج کرنے کا دستور ہے لیکن ہمارے خیال میں اگر انھیں کتاب کے آخر میں ایک ضمیمے کی شکل میں شریک کردیا جاتا تو زیادہ مناسب تھا ' " مشک " کی " خوشبو " کے لئے " عطار " کی " گویائی " کی ضرورت نہ ہونی چاہیے —

ترجمے سے پہلے ۱۷ صفحے براؤننگ کی سوانح عمری اور اس کی شاعری کی تنقید پر لکھے گئے ہیں ' یہ بہت اچھا ' اور کام کا ہے ' لیکن اگر براؤننگ کی کی شاعری کے بجائے ' اسکی نظم " ربی بن عذرا " کی تفصیلی تنقید کی جاتی ' اور اس میں جس خاص فلسفے کا ذکر کیا گیا ہے ' اسکی تشریح کردی جاتی ' تو اصل

نظم کے سمجھنے میں زیادہ آسانی ہوتی - ایک اور بات جو ہمیں نظر آئی ' یہ ہے کہ اس تنقیدی حصے میں انگریزیت کا رنگ بہت غالب ہے ' اور اُن حضرات کے لیے جو انگریزی طرز تنقید سے واقف نہیں ہیں' اِس کا سمجھنا ذرا دشوار ہے - مثلاً یہ جملے : —

" وہ ایک ایسا وقت منتخب کرتا ہے جو فعل کے وقوع میں آنے کے قبل یا بعد جب روح نہایت صفائی سے اپنی گہرائی کو ظاہر کرتی ہے یا کسی ایسے وقت جب کردار آرام کی حالت میں اپنے اخلاقی منظر کو دکھلاتے ہیں" غالباً سہو کتابت کی وجہ سے جملہ نا مکمل رہ گیا ہے —

"اس کے منظر انسان کے خیالات اور جذبات کے پس انداختہ پردے ہوتے ہیں"

" اس نے " نسبت " کا غیر معمولی طور پر خیال رکھا ہے"- یہ جملہ انگریزی تنقیدی جملے Sense of Proportion کا مفہوم رکھتا ہے' لیکن غیر انگریزی داں حضرات کی سمجھ میں آنا مشکل ہے - بہر حال ہم سمجھتے ہیں کہ کسی انگریزی شاعر کی تنقید کرتے وقت اس قسم کے جملوں اور طرز ادا کا آجانا قدرتی بات ہے - ہم اسے برا نہیں سمجھتے' بلکہ صرف اس قدر چاہتے ہیں کہ اُن کی تشریح بھی ساتھ ہی ساتھ کردی جاے ---

اصل ترجمہ صفحہ ۴۱ سے شروع ہوتا ہے - ۳۲ بند ہیں' ہم نے ہر بند کو انگریزی نظم کے ساتھ پڑھا - ترجمہ بہت سلجھا ہوا ہے' اور براؤننگ کی جیسی الجھی ہوئی عبارت کا اتنا سلیس ترجمہ کرنا یقیناً لائق مترجم کا قابل تحسین کارنامہ ہے - لیکن ترجمے میں بھی ہمیں تشریحی حاشیوں کی کسر نظر آئی - اگر اتنا اضافہ اور کر دیا جاتا تو کتاب موجودہ صورت سے بہیں زیادہ مفید ہو جاتی - اتنی عبارت کا ویسے ہی الفاظ میں ترجمہ مجہول بالمجہول کا حکم رکھتا ہے اور ترجمے کا اصلی فائدہ مفقود ہو جاتا ہے —

فاضل مترجم نے اکثر نئے الفاظ استعمال کئے ہیں - ان میں سے بعض بہت اچھے ہیں' ہم اسے اُردو زبان کے لئے فال نیک سمجھتے ہیں - مثلاً پیش فرضی (Pre Supposition) موقع تلاش (Opportunity-seekers) وغیرہ - ایک موقع پر برٹش میوزیم کے لئے "متحف برطانی" استعمال کیا گیا ہے' جو اصل سے زیادہ غیر مانوس ہے - اسی قسم کے اور بھی بعض لفظ ہیں جو ایک رخ جدت پسندی کو واضح کرتے ہیں مگر جامع نہیں -

کتاب جامعہ عثمانیہ کے نام معنون کی گئی ہے - ہم فاضل مترجم کی اس ادبی کاوش کو بہت قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں - اگر ہماری جامعہ کے دوسرے سپوت انہیں کی طرح ادبی خدمت پر کمر بستہ ہو جائیں' تو اردو ادب تھوڑے دنوں میں کچھ کا کچھ

هو جاے' اور جامعۂ عثمانیہ کا "مقصد وجود" پورا هو جاے—

کتاب چھوٹی تقطیع پر اچھی چھپی ہے' قلم جلی ہے - قیمت اور ملنے کا پتہ درج نہیں' غالباً مترجم صاحب سے (نظامت منزل' کنگ کوٹھی روڈ حیدرآباد) کے پتے سے مل سکے گی—

(و)

اقبال

(مولفۂ مولوی احمد دین صاحب بی - اے' ایڈوکیٹ' لاهور - صفحات ۲۸۴
چھوٹی تقطیع - قیمت دو روپئے چار آنے)

سر محمد اقبال کی شاعری پر بہت سے مضمون لکھے گئے ھیں' لیکن اس قدر تفصیل کے ساتھہ اب تک کسی نے اُن کی شاعری پر کوئی کتاب نہیں لکھی تھی۔ جس طرح اقبال کی شاعری جوش و خروش سے بھری ہوی ہے' اُسی طرح مولوی احمد دین صاحب بھی اس شاعری کے پر جوش مداح ھیں - اقبال کی شاید ھی کوئی اچھی نظم ایسی ہوگی جس پر مولوی صاحب نے جوش کے ساتھہ کچھہ نہ لکھا ہو اور اقتباس نہ دیا ہو۔ شروع کے ۱۴۰ صفحوں میں ابتدا سے آخر تک ہر قسم کی نظموں کا ذکر کیا ہے - دوسرے حصے میں (۱۴۲ سے ۲۱۴ تک) مضامین کلام سے بحث کی ہے - یہ مضامین یہ ھیں: نور توحید کی جوت' دل نواز مستقبل' خودی و خود داری و خود افزائی' مذہب' اخلاقیات' تہذیب نو' فلسفہ' و طنیت' عجمیت' پان اسلام ازم یا اتحاد سیاسیۂ ملیہ - تیسرے اور آخری حصے میں اقبال کے طرز بیان سے بحث کی گئی ہے - اس تقسیم سے بعض مضامین ایک حصے کے دوسرے حصے میں گڈ مڈ ہو گئے ھیں - لیکن اس میں شک نہیں کہ شاعر کی شاعری کا کوئی پہلو قابل مؤلف کی نظر سے نہیں بچا - یہ تنقید نہیں ہے بلکہ اقبال کی شاعری کے محاسن ھیں اور اس کا حق مولف نے پورا پورا ادا کر دیا ہے - آخر میں وہ اس تمام بیان کا خلاصہ ان الفاظ میں کرتے ھیں:—

"ڈاکٹر صاحب کا کلام اگرچہ تمام تر آورد ہے' لیکن اس میں انتہائی لطافت اور انتہائی ابھار ہے - یعنی فصاحت لفظی اور بلاغت معنوی دونوں کی پوری پوری رعایت ملحوظ ہے - جو مضمون ہے وہ نہایت صاف' برجستہ اور نکتہ سنجی اور ندرت

خیال کا پسندیدہ ترین نمونہ ہے' انداز بیان اور طرز ادا انوکھا اور دلکش ہے - اُن کی توجہ خیالات کی رفعت اور معانی کی بلندی کی طرف زیادہ رہتی ہے - صنائع بدائع' تشبیہات و استعارات کے پیچ میں وہ نہیں پڑتے' لیکن باوجود اس کے لفظوں کی لطافت اور ترکیبوں کی نزاکت کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے - اِن کا جام شاعری اس سوگواری کی تلخی سے پاک ہے جو قومی مرثیہ گویوں کے کلام میں پائی جاتی ہے - وہ ماضی کے ساتھ نہیں ہیں بلکہ شاندار مستقبل کے مژدہ گو ہیں - اُن کی شگفتہ طبیعت ایک بلبل ہے جو خزاں کی نوحہ خوانی نہیں کرتی بلکہ بہار کی آمد کا نغمہ گاتی ہے - وہ اپنی شاعری میں ملت جدیدہ کی دماغی تعمیر میں بہت بڑا حصہ لے رہے ہیں"—

مولوی صاحب نے طرز بیان میں بھی مضامین ہی سے بحث کی ہے - ہم اس بات سے خوش ہیں کہ انہوں نے شاعری کے داخلی پہلو پر نظر ڈالی ہے مگر طرز بیان میں داخلی اور خارجی دونوں پہلو شریک ہیں - اسی حصے کے آخر میں انہوں نے اردو اور اہل پنجاب کے عنوان سے بھی چار پانچ صفحے لکھے ہیں - اُن کا فرمانا بالکل بجا ہے کہ ہر زبان پر جب وہ کسی دوسرے مقام پر پہنچتی ہے' وہاں کے طریق معاشرت' تمدنی حالات اور طرز بیان کا اثر پڑتا ہے اور اس لئے وہاں کے الفاظ بھی اُس زبان میں داخل ہو جاتے ہیں - لیکن اِس کے یہ معنے نہیں ہیں کہ ہر پنجابی' پوربی یا دکھنی محاورے کا لفظی ترجمہ زبان میں داخل ہونے کا حق رکھتا ہے - خود اقبال کی زبان اس کی شاہد ہے - کیا اچھا ہوتا کہ اگر مولوی صاحب بعض ایسے الفاظ لکھ دیتے جو اُن کی رائے میں اردو زبان میں داخل ہونے کے قابل ہیں - اردو زبان کو دوسری زبانوں کے لفظ لینے سے عار نہیں' لیکن بحث اس میں ہے کہ وہ کونسے لفظ ہیں جو لینے کے قابل ہیں - یہ صرف اُسی صاحب ذوق سلیم کا حق ہے جو زبان کا ماہر ہے اور اس کے استعمال پر کامل قدرت رکھتا ہے - جب وہ کوئی نیا لفظ استعمال کرتا ہے تو لفظ خود بول اُٹھتا ہے کہ میری جگہ یہاں ہے—

جو لوگ اقبال کی شاعری کے قدرداں ہیں وہ اس کتاب سے بہت لطف اور حظ اٹھائیں گے—

صبح وطن

(کلام پنڈت برج نراین چکبست لکھنوی مرحوم - مطبوعۂ انڈین پریس الہ آباد)

پنڈت برج نراین چکبست مرحوم کی جواں مرگی پر تمام ہندوستان کے صاحب ذوق اصحاب نے نوحہ کیا ہے - اور اس میں کچھہ شبہ نہیں کہ اُن کی بے وقت وفات سے اردو ادب کو صدمہ پہنچا ہے - مرحوم بہت ہی خوش گو اور خوش مذاق شاعر تھے - بچپن ہی سے شاعری کا چسکا تھا اور " شاید پہلی غزل نو برس کی عمر میں کہی تھی اور اس زمانے سے برابر شعر کہتے رہے - اساتذہ میں آتش، غالب اور انیس کے کلام کے شیدا تھے "- اُن کا مذاق خاص لکھنوی تھا ، مگر چونکہ طبیعت میں جودت تھی وہ اُنھیں شاعرانہ الفاظ اور زبان کو جو ایک مدت سے پستی کی جانب جاری تھی، جذبات عالیہ کے اظہار میں کام لائے - اُن کے کلام میں قومی امنگ، وطن پرستی، فلسفۂ حیات کی روئداد اور فطرتی مناظر جابجا نظر آتے ہیں - ان کا کلام پختہ ، دل گداز اور فصیح ہے -

اِس مجموعے پر جناب سر تیج بہادر سپرو نے بہت اچھا اور دل چسپ دیباچہ لکھا ہے - جو صاحب اپنی شاعری کو نئے رنگ میں جلوہ گر دیکھنا چاہیں وہ چکبست کے کلام کا ضرور مطالعہ کریں -

محاکمۂ قطعات اِبن یمین و سعدی مع سوانح اِبن یمین

(مولانا مولوی علی شبیر صاحب : سررشتہ دار انتظامی ہائی کورٹ، حیدر آباد دکن - قیمت درج نہیں - مؤلف سے مل سکتی ہے) -

کوئی پچیس سال کا عرصہ ہوتا ہے کہ راقم نے حیدر آباد میں ایک مجلس بنام " انجمن یادگار سعدی " قائم کی تھی جسمیں سعدی کے کلام کے محاسن پر اکثر بحث ہوتی تھی - اسی انجمن کی ایک مجلس میں مولوی علی شبیر صاحب نے ایک مضمون ابن یمین اور سعدی کے قطعات پر ایک محاکمہ پڑھا تھا - اب اُنھوں نے اسی مضمون کو بہت شرح و بسط کے ساتھہ تحریر فرمایا ہے اور ابن یمین کے کچھہ حالات

بھی اضافہ کردیے ھیں - اتنے زمانے کے بعد جو ھم نے یہ مضمون پڑھا تو بہت لطف آیا۔ قابل مولف نے نہایت قابلیت سے داد سخن دی ہے جس سے اُن کے ذوق سلیم کا پتہ لگتا ہے - بعض محاکمے بہت قابل تعریف ھیں اور اُن میں جن نکات کو بیان کیا ہے وہ غور کے قابل ھیں - صاحبان ذوق اِس کتاب کو پڑھکر بہت لطف حاصل کریں گے—

مرزا عبدالرحیم خانخاناں کی دوھاولی

(مرتبۂ بھوانی پرشاد صاحب ' مینیجر رسالۂ سائنس کی صدا ' حیدر آباد دکن - مطبوعۂ اعجاز پرنٹنگ پریس چھتہ بازار ' حیدر آباد دکن - صفحات ۹۰ ' قیمت لکھی نہیں)

بھوانی پرشاد صاحب شکریے کے مستحق ھیں کہ اُنھوں نے مرزا عبدالرحیم خانخاناں کے دوھے چھاپ کر شایع کئے ھیں- اور یہ اور بھی اچھا کیا ہے کہ مختلف دوھے مختلف عنوانوں کے تحت میں درج کئے ھیں اور ساتھہ ساتھہ اُن کا ترجمہ بھی اردو میں لکھہ دیا ہے - خانخاناں بڑے صاحب علم' صاحب ذوق اور علم و ھنر کے بہت بڑے سر پرست تھے- اُن کا کلام بہت قابل قدر ہے - جو صاحب ھندی کا ذوق رکھتے ھیں وہ اِس کتاب کی اور بھی زیادہ قدر کریں گے - کیا اچھا ھوتا اگر یہ کتاب زیادہ اچھی اور صحیح چھپتی اور حسب ضرورت اعراب بھی لگا دئے جاتے - اگر ساتھہ ھی یہ دوھے ھندی حروف میں بھی لکھہ دیے جاتے تو پڑھنے والوں کو اور بھی زیادہ آسانی ھوتی - تاھم قابل مرتب کے شکر گزار ھیں اور اُن کی محنت کی داد دیتے ھیں—

عقوبت گناہ

(مترجمۂ مولوی نظیر حسین صاحب فاروقی - مطبوعۂ تاج پریس' حیدر آباد دکن مینیجر صاحب تاج پریس سے دو آنے میں مل سکتا ہے) -

---

یہ ایک چھوٹا سا بہت دل چسپ اور عبرت انگیز فسانہ ہے اور عبرت خیز بھی ہے - پڑھنے کے قابل ہے - قابل مترجم کے فرزند افضل حسین سلمۂ نے جو ھونہار طالب علم ھیں' اُسے عام فائدے اور دلچسپی کی نظر سے شایع کیا ہے —

اصلاح سخن

(مرتبۂ جناب محمد عبدالعلی صاحب شوق سندیلوی - صفحات ۲۳۰)

عنوان سے کتاب کا مضمون ظاہر ہے' لیکن اصلاحیں جس ڈھب سے حاصل کی گئی ہیں وہ عجیب و غریب' ہے اور قابل مرتب کی جدت طبع پر دلالت کرتا ہے - ہماری شاعری میں اساتذہ کی اصلاحیں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں اور بعض اصلاحیں جو قدیم استادوں کی دستیاب ہوئی ہیں یا مشہور چلی آتی ہیں وہ بڑی آب و تاب اور فخر کے ساتھ تذکروں یا اسی قسم کی دوسری تالیفات میں درج کی جاتی ہیں - کچھ عرصہ ہوا ہمارے عنایت فرما جناب صفدر مرزا پوری نے بھی ایک کتاب اسی مضمون کی شایع کی تھی' مگر اِس میں اور اُس میں فرق ہے - وہ قدیم اساتذہ کی اصلاحیں نہیں اور یہ ہم عصر شعرا کی ہیں - اِن اصلاحوں کے بہم پہنچانے میں جناب شوق نے بڑی ستم ظریفی سے کام لیا ہے - حضرت نے ایک ہی غزل ہندوستان کے مختلف صوبوں کے مشہور شعرا کی خدمت میں بھیجی اور شاگردی کے ادعا کے ساتھ اصلاح کی درخواست کی - بعض کی خدمت میں تو باقاعدہ شیرینی کے دام پیش کر کے شاگردی کی رسم ادا کی ہے - اِن بزرگواروں نے حسب معمول شاگرد سمجھ کر غزل میں اپنے فہم کے موافق اصلاح دی اور از راہ استادی کچھ کچھ ہدایتیں بھی کیں - اس طرح انہوں نے اپنی سولہ غزلوں کو جن پر کم و بیش ۳۵ نامور اور مستند شعرا کی اصلاحیں ہیں' اس کتاب میں جمع کر دیا ہے - اصلاح کا یہ سلسلہ کوئی پانچ سال تک رہا - ایک اقبال اور اکبر مرحوم تو اِن کے دام میں نہیں آئے' باقی کوئی اِن کی زد سے نہیں بچا - بعض نے دبی زبان سے پیچھا چھڑانا چاہا مگر حضرت شوق کب مانتے ہیں' سر ہو گئے' شاگرد ہو کے رہے' اصلاح لے کے چھوڑی - بعض حضرات کو جب اس کی سن گن معلوم ہوئی کہ اُن کی اصلاحی غزلیں دوسری جگہ بھی اسی غرض سے گئی ہیں تو انہیں شبہ ہوا اور حضرت شوق سے دریافت کیا - معلوم ہوتا ہے کہ شوق صاحب نے کچھ ایسی تھپکی دی کہ وہ خاموش ہو گئے - استادی کا شوق بھی برا ہوتا ہے' جل میں آگئے اور برابر اصلاحیں دیتے رہے - اُنہیں اصلاحوں کی یہ پوٹ ہے جو چھپ کر ہمارے سامنے آئی ہے —

ترتیب کتاب کی یہ ہے کہ پہلے جلی قلم سے اپنی پوری غزل لکھ دی ہے - اس کے بعد ہر صفحہ کے شروع میں اپنا ایک ایک شعر جلی قلم سے لکھا ہے اور حاشیے پر اساتذہ کے نام لکھے ہیں اور صفحے کے متن میں اصلاح نقل کر دی ہے' جس شعر پر کسی استاد نے کچھ ارشاد فرمایا ہے وہ بھی اصلاح کے ساتھ لکھ دیا گیا ہے - جن

حضرات نے جن اشعار پر صاد بنایا ہے وہاں (ص) بنا کر اُن کے تخلص لکھ دئے ہیں اور جن حضرات نے شعر میں کوئی ترمیم نہیں کی، اُن کے نام ہر صفحے کے آخر میں لکھے ہیں اور کوئی نشان نہیں بنایا ہے - اگر کسی استاد نے کمال شفقت سے اُسی زمین میں کچھ اشعار نذر کئے ہیں تو وہ بھی نام کی صراحت کے ساتھ نقل کر دئے ہیں —

اس مجموعے کو دیکھکر ہمیں ہنسی بھی آئی اور افسوس بھی ہوا - ہنسی تو حضرت شوق کی شوخی پر آئی اور افسوس اُن بزرگوں کی سادگی پر ہوا - خیر اس کا بھی کچھ مضائقہ نہ تھا کہ وہ یہ سب اصلاحیں چھاپ دیتے لیکن غضب یہ کیا کہ کتاب کے آخر میں اِن صاحبوں کے وہ تمام خطوط بھی شایع کردئے ہیں جو اُنھوں نے زمانۂ اصلاح میں اپنے سعادت مند شاگرد کو لکھے تھے - اِن سادہ دل بزرگوں نے شاگرد سمجھ کر کمال بے تکلفی اور سادگی سے جو جی میں آیا لکھ دیا ہے، وہ کیا جانتے تھے کہ اس کا انجام کیا ہونے والا ہے - ایک صاحب شاگردی کی مٹھائی مانگ رہے ہیں، دوسرے اپنے دیوان کے مصارف کے لئے چندے کا اصرار فرما رہے ہیں - تیسرے صاحب نے شاگردی کی مٹھائی کے ساتھ استاد کی خدمت کا بھی صاف صاف اشارہ کیا ہے - ایک صاحب فرماتے ہیں کہ جواب کے لئے آدھ آنے کا ٹکٹ جو بھیجا ہے تو کیا اب سلسلے میں لفافے نہیں ملتے؟ - اِن بے چاروں کو کیا معلوم تھا کہ اُن کا شاگرد رشید یہ بھانڈا چوراہے میں پھوڑے؟ - غرض حضرت شوق نے اپنے " اساتذۂ کرام " کا نام اچھالنے اور اُن کی رسوائی میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا - جناب شوق اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ "اس درمیان میں (یعنی زمانۂ اصلاح میں) اساتذہ کے جو خطوط نکات ادبیہ کا گلدستہ نظر آے وہ بھی ضمیمے کے طور پر آخر کتاب میں درج کردئے گئے ہیں اگر کسی استاد کو یہ امر کچھ ناگوار گزرے تو مجھے معاف کریں میں نے جو کچھ کیا ہے وہ ضیافت طبع ارباب ذوق کے لئے کیا ہے اور اساتذۂ معتبرہ کے فیوض عام کرنے کے لئے"۔ اول تو یہ خط نکات ادبیہ کا ایسا گلدستہ نہیں جیسا کہ حضرت شوق فرماتے ہیں اور اگر کچھ ادبی بحث ہے بھی تو چاہئے تھا کہ وہی خط چھاپتے جس کا تعلق ادب سے ہے۔ غیر متعلق خطوط یا خطوط کے ایسے حصوں کے چھاپنے سے جن میں کوئی ادبی بحث نہیں، اُن کا کیا مقصد ہے؟ - شاید "ضیافت طبع ارباب ذوق" مدنظر ہو - طبع کے بعد معافی مانگنا یہ اور ستم ہے - ہمارے خیال میں اُن کو یہ حق حاصل نہ تھا کہ وہ خانگی خطوط بغیر اجازت کے شائع کرتے - مگر شاگرد تو بیٹے کے برابر ہوتا ہے، اُسے اجازت کی کیا ضرورت ہے —

ظاہر ہے کہ جب یہ سفینۂ زرین حضرات اساتذہ کی خدمت میں پہنچے گا تو بہت جھنجھلائیں گے، بگڑیں گے، خفا ہوں گے، مگر اس سے کیا حاصل؟ جو ہونا تھا سو ہوگیا۔ مصلحت یہ ہے کہ اب خاموش رہیں اور اِس سے عبرت حاصل کریں اور شاگردوں کی

اصلاح سے پہلے اپنی اصلاح حال کی طرف متوجہ ہوں —

اب رہی اصلاح، جس کے مفید ہونے پر بڑا طومار باندھا گیا ہے، سو واجبی ہی واجبی ہے - بعض صاحبوں نے اصلاح کے شوق میں سرے سے مضمون ہی بدل دیا ہے - کوئی صاحب مطلب نہیں سمجھے اور شعر کاٹ کے رکھہ دیا ہے - کسی نے اصلاح دے کر شعر کو پست کر دیا ہے اور کہیں مضمون ہی خبط ہوگیا ہے - البتہ کہیں کہیں کوئی اصلاح اچھی بھی نظر آجاتی ہے - خیر جو صاحب بصیرت ہیں وہ تو اِن اصلاحوں کو دیکھکر اُن کی حقیقت سمجھہ لیں گے، لیکن جو مبتدی ہیں یا جنھیں شعر کہنے کا نیا نیا شوق ہوا ہے، اُنھیں بڑی الجھن پیدا ہوگی اور کچھہ تعجب نہیں کہ وہ اصلاحوں کے اس طومار سے گم راہ ہوجائیں- جہاں حضرت شوق نے اتنا دہتراگ کیا تھا، اگر وہ ہر شعر کی اصلاحوں پر ایک مختصر سا محاکمہ بھی ساتھہ ساتھہ لکھہ دیتے تو بہت اچھا ہوتا اور اِس حالت میں یہ کتاب کچھہ نہ کچھہ ضرور مفید ہوجاتی —

اس کتاب میں ایک دوسری جدت یہ ہے کہ حضرت نیاز فتح پوری صاحب نے تو شروع میں کتاب کی تقریب لکھی ہے، دیباچہ ہمارے محترم مولانا شرر مد ظلہ نے تحریر فرمایا ہے: مقدمہ جناب سلطان حیدر صاحب جوش نے لکھا ہے: تبصرے جناب امیر احمد صاحب علوی اور ہمارے شفیق مکرم جناب ڈاکٹر صدیقی صاحب نے تحریر فرمائے ہیں - یہ سب تحریریں سنجیدہ اور بڑی شان کی ہیں اور پڑھنے کے قابل ہیں —

ہم بھی جناب شوق کے شکر گزار ہیں کہ اُنھوں نے ادبی تفریح کا ایسا اچھا سامان جمع کیا ہے جو کسی دوسرے سے ممکن نہ تھا اور جو محنت اور کاوش اُنھوں نے اس میں اُٹھائی ہے وہ فی الحقیقت قابل داد ہے

تعلیم

التربیة الاستقلالیة

دارالمصنفین کے مشہور رکن مولانا عبدالسلام صاحب ندوی نے اس نام سے ایک فرانسیسی تصنیف "انیسویں صدی کا امیل" کا ترجمہ، عربی ترجمے سے کیا ہے - "امیل" در اصل فرانس کے مایۂ ناز انقلاب پسند فلسفی روسو کی ایک تصنیف کا نام ہے،

جس میں اس نے فطرت اطفال کے متعلق عجیب و غریب نظریے بیان کیے ہیں' اور "رجعت بہ فطرت" (Back to nature) کے اصول کو تربیت اطفال کا معیار قرار دیا ہے۔ الفونس ایکروس کی فرانسیسی تصنیف "انیسویں صدی کا ا میل" جس کا اردو ترجمہ زیر تبصرہ ہے' روسو کی اسی کتاب کے ضمیمے کے طور پر لکھی گئی ہے—

اردو میں تربیت اطفال پر (خاص کر نفسیاتی حیثیت سے) اب تک کوئی مکمل کتاب نہیں لکھی گئی ہے۔ اس حیثیت سے موجودہ ترجمہ ملک کے لئے یقیناً مفید ثابت ہوگا۔ ترجمہ چار کتابوں پر مشتمل ہے اور ہر کتاب دو میاں بیوی کے خانگی خطوں کی صورت میں لکھی گئی ہے۔ پہلی کتاب میں جو خطوط ہیں وہ زیادہ تر ایام حمل' اور ولادت کے متعلق ہیں: اور اُن میں ماں اور بچے کی نگہداشت کے متعلق مفید مشورے درج ہیں۔ دوسری کتاب میں بچپن سے لیکر بلوغ کے زمانے تک بچے کے ذہنی خصائص' اور اُن کی متعلقہ تربیت کا بیان ہے۔ تیسری کتاب قریب البلوغ لڑکے کی تربیت اور نگہداشت کے متعلق ہے۔ چوتھی کتاب میں باپ اور بیٹے کے خطوط درج ہیں—

اِس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اِس میں نفسیات کے ادق مسائل کو روز مرہ کی بے تکلف زبان میں بیان کیا گیا ہے' اور اس اعتبار سے یہ بہت کم علمی اور تدقیقی' اور بہت زیادہ عملی ہوگئی ہے۔ اگرچہ مصنف نے مختلف فیہ مسایل نفسیات سے پہلو بچایا ہے' لیکن کام کی' اور موٹی موٹی باتیں سب آگئی ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ یہ کتاب ہندوستانی ماؤں کے لیے خاص طور پر مفید ہوگی —

ترجمہ اگرچہ رواں ہے مگر ترجمہ پن ضرور پایا جاتا ہے' اور ایک عیب یہ بھی ہے کہ عبارت جابجا بہت مشکل ہوگئی ہے۔ کاش فاضل مترجم ترجمہ کرتے وقت اِس کا لحاظ رکھتے کہ اِس کتاب کا بڑا مقصد ہندوستانی والدین' اور خاص کر ماؤں کی تربیت ہے: اور پھر خطوں کی عبارت تو اتنی ادق اور پیچیدہ نہ ہونی چاہئیے۔ "مشق و تمرین' " مواظبت و مزاولت" "رفق" " تشتت و انتشار" " اباطیل و اکاذیب" —— یہ لفظ ہمارے ملک کی عورتیں تو کیا' معمولی تعلیم یافتہ مرد بھی نہیں سمجھ سکتے۔ ترجمے کے نام کے انتخاب میں بھی ضرورت سے زیادہ عربیت کو دخل دیا گیا ہے۔ یونانی اور لاطینی زبانوں کی تعلیم کے متعلق جو بحث ہے' وہ ہمارے یہاں کے والدین کے لئے خاص طور پر سبق آموز ہے۔ اسی طرح سے دوسری کتاب کے نویں اور دسویں خط جو مذہبی اور اخلاقی تعلیم کے متعلق ہیں' اس قابل ہیں کہ اُن پر غور کیا جائے' اور ہمارے ملک میں بھی اِن چیزوں کی تعلیم دیتے وقت' بچے کی فطرت کو مد نظر رکھا جائے —

کتاب کے شروع میں فاضل مترجم کا تعلیم قدیم و جدید کی خرابیوں پر ۹۶ صفحے

کا ایک مقدمہ بھی ہے، یہ مقدمہ اگرچہ نفس کتاب سے زیادہ تعلق نہیں رکھتا، اور اُس میں بجائے نفسیاتی مسائل کے، قدیم عربی نصاب کے ارتقاء سے بحث کی گئی ہے — پھر بھی بہت کچھ قابل قدر ہے - اِس میں فاضل مترجم نے بہت کاوش سے قدیم عربی تعلیم کی تاریخ مرتب فرمائی ہے، اور رفتار زمانہ کے ساتھ جو جو تبدیلیاں اِس میں ہوتی رہیں اُن کا ذکر کیا ہے—

کتاب مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی طرف سے شایع ہوئی ہے، اور مسلم یونیورسٹی کے مطبع میں چھپی ہے، حجم ۳۰۸ صفحے، لکھائی، چھپائی، کاغذ سب کچھ اچھا ہے - دفتر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڈھ سے مل سکتی ہے - قیمت درج نہیں غالباً ۲ روپے ہوگی —

فطرت اطفال

یہ کتاب بھی آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی طرف سے شایع ہوئی ہے، اور ایک انگریزی تصنیف (The Scientific Training of Children) کا ترجمہ ہے - مترجم مولوی حامد حسن صاحب قادری بچھرایونی اڈیٹر "اخبار سعید" کانپور ہیں - اصل کتاب ہمارے پیش نظر نہیں ہے، لیکن پوری کتاب کے پڑھنے کے بعد ترجمہ کی خوبی کا احساس ہوتا ہے - عبارت اگرچہ عام طور پر مشکل ہے - لیکن گنجلک نہیں ہے—

زیر تبصرہ ترجمہ کسی جامع اور مفصل تصنیف کا ترجمہ نہیں ہے، بلکہ چار جز کا ایک مختصر سا رسالہ ہے، جو سات ابواب میں منقسم کیا گیا ہے - ظاہر ہے کہ نفسیات اطفال جیسے اہم موضوع پر اتنا مختصر رسالہ کافی نہیں ہے - بہت سی باتیں تشریح و توضیح کی محتاج رہ گئی ہیں، تجریدی بیانات اور کلئے بہت زیادہ ہیں - عملی مثالیں، اور تشریح بہت کم ہے، لیکن یہ نقص اصل انگریزی تصنیف کا ہے - ہمیں اُمید ہے کہ فاضل مترجم صاحب، جیسا کہ اُنہوں نے اپنے تعارف میں ظاہر کیا ہے، آئندہ جو کتاب ترجمے کے لئے منتخب کریں گے وہ جدید تر نفسیاتی مسائل کی حامل ہوگی، اور مبسوط بھی ہوگی - انگریزی میں فطرت اطفال کے متعلق ایک سے ایک بہتر کتاب موجود ہے - تربیت اطفال کے متعلق اردو میں ادبی ذخیرہ اس قدر کم ہے کہ موجودہ ترجمہ بھی بہت غنیمت معلوم ہوتا ہے: اور معلمین اور والدین کے لئے ضرور مفید

ثابت ہوگا —

آخر میں ایک صفحہ کی فہرست اصطلاحات بھی لگائی گئی ہے Creative Energy کا ترجمہ تولیدی قوت کیا گیا ہے - تخلیقی قوت زیادہ موزوں ہوتا - تولیدی قوت کا مفہوم دوسرا ہی ہے اسی طرح سے Impressions کا ترجمہ اثرات کیا گیا ہے - عام بول چال میں یہ لفظ کام دے سکتا ہے، لیکن لفظ Impressions در اصل نفسیات کی ایک خاص اصطلاح ہے - اُس کا صحیح ترجمہ ارتسامات ہو سکتا ہے - ہم پہلے بھی کسی موقع پر عرض کر چکے ہیں، اور اب پھر عرض کرتے ہیں کہ علمی کتابوں کے مترجموں کو حتی الوسع اصطلاحات کے وہی ترجمے استعمال کرنے چاہئیں، جنھیں دوسرے حضرات استعمال کرتے ہیں، ایک ہی اصطلاح کے اگر دس مختلف ترجمے استعمال کئے جائیں گے تو اس سے ہماری زبان کی علمی صلاحیت کو صدمہ پہنچے گا —

کتاب مسلم یونیورسٹی پریس میں طبع ہوئی ہے - کاغذ، لکھائی، چھپائی سب کچھ اچھا ہے - قیمت درج نہیں - افسوس ہے کہ کوئی فہرست مضامین بھی نہیں لگائی گئی - دفتر مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڈھ سے مل سکتی ہے —

(و)

تمرینات النحو

یہ کتاب مولوی غلام سرور خاں صاحب پرنسپل اسسٹنٹ ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن صوبۂ سرحد کی تالیف ہے —

فاضل مؤلف نے جدید اصول تعلیم کے مطابق اِس کو مرتب کیا ہے - ہر سبق میں ایک قاعدہ نحوی لکھکر چند مشقی سوالات دئے ہیں جس سے طالب علم کو عربی جملوں کی ترکیب کرنے، اعراب لگانے اور ترجمہ کرنے کی کافی مہارت پیدا ہو سکتی ہے اور بڑی آسانی کے ساتھ اِس کے ذریعہ عربی لکھنے پڑھنے اور ترجمہ کرنے پر قدرت حاصل کی جا سکتی ہے —

جہاں کہیں سمجھانے کے لئے مثالیں دی گئی ہیں یا ترجمے کے لئے عربی جملے دئے گئے ہیں اُس میں حتی الامکان قرآنی آیتوں کا التزام کیا گیا ہے جس سے طالب علم کو قرآنی طرز ادا سے خاص مناسبت ہو سکتی ہے —

یہ کتاب اسکول کی ادنیٰ اور اعلیٰ جماعتوں کے لئے یکساں مفید ہے اور اُن مدرسین کے لئے بھی (جو غریب اردو کو علم کا ذریعہ بنانے اور اُس سے مدد لینے میں کسر شان نہیں سمجھتے) رہنمائی کا بہت اچھا کام دے سکتی ہے - اُردو میں اِس غرض کے لئے

جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں، اُن میں سب سے بہتر اور اپنی خصوصیات کے اعتبار سے نہایت مفید معلوم ہوتی ہے—

ضخامت ۱۷۱ صفحے کی ہے، لکھائی، چھپائی بری نہیں، کاغذ بھی اچھا خاصا ہے۔ قیمت درج نہیں۔ ملنے کا پتا قومی کتب خانہ ریلوے روڈ لاہور ہے—

(س)

تاریخ

بدھ اور اُس کا مت

(ترجمہ و تالیف جناب رائے بہادر شیونرائن شمیم مطبوعہ کاشی رام پریس لاہور)

بدھ دنیا کے چند نہایت واجب الاحترام اور عظیم الشان انسانوں میں سے ہیں اور اُن کا مت بھی ویسا ہی شاندار ہے، جیسے وہ خود تھے اور دنیا کے مذاہب میں خاص حیثیت رکھتا ہے۔ بدھ کا جنم بھوم اگرچہ ہندوستان ہے مگر یہ مذہب، مدت ہوئی، یہاں سے مٹ چکا۔ گو بدھ مت والوں کی اتنی تعداد نہ ہو جتنی بتائی جاتی ہے یا وہ حقیقی بدھ مت کے پیرو نہوں، مگر اِس میں شک نہیں کہ اِس کا اثر دنیا میں ہر جگہ ہے اور روز بروز ترقی کر رہا ہے۔ اردو میں بدھ اور بدھ مذہب پر دو چار کتابیں اِس سے قبل لکھی گئی ہوں لیکن اُن کے لکھنے والے بدھ مت کے پیرو نہیں ہوں اور اس لئے زیادہ مستند اور معتبر نہیں ہو سکتیں اِس کتاب کے مترجم اور مؤلف بدھ مذہب پر ایمان رکھتے ہیں اور اِس کے لکھنے میں تحقیق سے کام لیا ہے—

اس کتاب کے دو حصے ہیں:- پہلا حصہ "بدھ اور اس کا مت" ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے جس کے لکھنے والے ایک امریکی مسٹر سٹراس ہیں جو بدھ مت کے پیرو ہیں۔ دوسرے حصے میں جناب شمیم کے بعض مضامین ہیں جو اُنہوں نے وقتاً فوقتاً بدھ مذہب اور اُس کے بعض مسائل پر لکھے تھے۔ ہم نے اُس کتاب کو بڑے شوق سے پڑھا اور حقیقت یہ ہے کہ اِس سے بہتر کوئی کتاب ہماری زبان میں نہیں لکھی گئی۔ طرز بیان بہت صاف اور مؤثر ہے۔ اس کو پڑھ کر بدھ مت کی عظمت دل میں پیدا

ہوتی ہے اور یہی اِس کی اصل غرض ہے - جناب شمیم کے مضامین جو دوسرے حصے میں ہیں ، بہت دلچسپ اور محققانہ ہیں - اُنہوں نے بعض اُن غلط فہمیوں کو بھی رفع کیا ہے جو بدھ اور اُس کے مت کے متعلق عام طور سے پھیلی ہوئی ہیں —

جو صاحب بدھ اور اُس کے مت کے حالات پڑھنے کا شوق رکھتے ہیں ، اُنہیں یہ کتاب ضرور پڑھنی چاہیے کیونکہ اِس سے مستند اور بہتر کتاب اُردو میں دوسری نہیں ملے گی اور ہمیں یقین ہے کہ وہ اِس کے مطالعے سے ضرور خوش ہونگے —

افسوس ہے کہ قیمت اور ملنے کا پتہ درج نہیں ہے - شایقین جناب شمیم سے لاہور کے پتے سے دریافت فرما سکتے ہیں —

یادایام (اعنی) تاریخ گجرات

مؤلفہ مولانا حکیم سید عبدالحی مرحوم سابق ناظم ندوۃ العلما - بڑی تقطیع ، صفحات ۷۲ علاوہ دیباچہ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے - شبلی بک ڈپو ، لکھنؤ سے مل سکتی ہے

مولانا ے مرحوم حکیم ، عالم ، شاعر اور مؤرخ سب ہی کچھ تھے اور بہت اچھا علمی و ادبی مذاق رکھتے تھے - یہ کتاب اُنہوں نے نواب صدر یار جنگ بہادر (مولانا حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی) کی فرمائش سے لکھی تھی اور اول بار آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کی طرف سے شایع ہوئی تھی - شروع کے ۲۷ صفحوں میں گجرات کے عہد اسلامی کی مختصر تاریخ ہے اور باقی حصے میں گجرات کے مسلمان علما و فضلا ، صوفیا اور وزرا کے حالات درج ہیں - اگرچہ یہ حالات مختصر ہیں مگر جہاں تک فاضل مؤلف کو تاریخوں کی تلاش سے دستیاب ہوے وہ اُنہوں نے بے کم و کاست لکھدیے ہیں

مذهب

خطبات مدراس

(یعنی وہ خطبے جو مولانا سید سلیمان ندوی نے گزشتہ سال مدراس کے انگریزی مدرسوں کے طلبہ وغیرہ کے سامنے دیے - قیمت ایک روپیہ چار آنے - مطبع معارف اعظم گڑھ - صفحات ۱۶۲) —

یہ اُن آٹھ خطبوں کا مجموعہ ہے جو مولانا سید سلیمان صاحب نے "مسلم ایجوکیشنل ایسوسی ایشن آف سدرن انڈیا" کی درخواست پر مدراس کے انگریزی مدرسوں کے طالب علموں اور عام مسلمانوں کے سامنے لالی ہال (مدراس) میں ہفتہ وار دئے - ان میں سیرت نبوی کے مختلف پہلوؤں پر بحث ہے، جن کی تفصیل یہ ہے :—

۱- انسانیت کی تکمیل صرف انبیا کی سیرتوں سے ہو سکتی ہے - ۲- عالم گیر اور دائمی نمونۂ عمل صرف محمد رسول اللہ صلعم کی سیرت ہے - ۳- سیرت محمدی کا تاریخی پہلو - ۴- سیرت محمدی کا تکمیلی پہلو - ۵- سیرت محمدی کی جامعیت - ۶- سیرت محمدی کی عملیت یا عملی پہلو - ۷- پیغمبر اسلام علیہ السلام کا پیغام ۸- پیغام محمدی —

خورشید صداقت

(مؤلفہ خواجہ اختر - چھوٹی تقطیع، صفحات ۱۲۸ قیمت ایک روپیہ مطبوعہ لاہور پرنٹنگ پریس)

اس کتاب کے پہلے حصے میں عبادات، معاملات، قرآن شریف پر کچھ لکھا ہے - دوسرے حصے میں اُن پیشین گوئیوں کا ذکر ہے جو آنحضرت کی بعثت کے متعلق پہلے آسمانی صحیفوں میں مذکور ہیں - تیسرے حصے میں یورپ اور ایشیا کے غیر مسلم محققین کی رائیں اسلام اور بانئی اسلام کے متعلق درج ہیں - یہ حصہ دل چسپ ہے —

متفرق

—:•:—

مذاکرات [سال اول]

یہ مجلس مذاکرۂ علمیہ حیدرآباد دکن کے یک سالہ (یعنی سال گزشتہ کے مضامین کا مجموعہ ہے جو اِس مجلس کے بعض اجلاسوں میں پڑھے گئے—

حیدرآباد ایک نرالی قسم کا شہر ہے، جس کی مثال ہندوستان بھر میں تو کیا کہیں بھی نہیں ملتی - جو لوگ حیدرآباد سے باہر حیدرآباد کی نسبت کچھ لکھتے پڑھتے یا کہتے سنتے ہیں وہ ایک قسم کی شاعری کرتے ہیں، اور شاعری بھی بے سروپا - جس طرح ایلورا اور اجنٹا کے غار بے دیکھے سمجھ میں نہیں آسکتے، اسی طرح حیدرآباد کو بھی بے دیکھے کوئی نہیں جان سکتا - یہ جگہ بڑائی کی نہیں سیر کی ہے اس پر بھور کے لڈوؤں کی پرانی مثل صادق آتی ہے - جو کھائے وہ بھی پچھتائے اور جو نہ کھائے وہ بھی پچھتائے بعض کہتے ہیں کہ نہیں یہ سیر کا مقام نہیں برتنے کی جگہ ہے، مگر اس کے لئے خاص دل و دماغ اور ذہن کی ضرورت ہے اتنا ہم جانتے ہیں کہ بعض باتیں جو کتابوں میں پڑھتے چلے آتے تھے وہ یہاں آکر سمجھ میں آئیں - اس کی وضع نہ قدیم ہے نہ جدید ہے اور نہ بین بین ہے - پھر کیا ہے؟ یہ بات لکھنے میں نہیں آسکتی اور نہ بتانے سے سمجھ میں آسکتی ہے یہ دیکھنے اور برتنے کی چیز ہے—

یہ شہر اہل علم اور اہل فن اور خاصکر شاعروں سے پٹا پڑا ہے، کاش کوئی قوت ایسی ہوتی جو اُن سے کام لے سکتی - کہتے ہیں کہ یہاں مل جُل کر بیٹھنا اور مل کر کام کرنا راس نہیں آتا - شاید آب و ہوا کا قصور ہے - مگر یہ کاہلوں کا حیلہ اور کام نہ کرنے والوں کا وہم ہے - ایک خیال یہ بھی ہے کہ لوگ یہاں اپنی ہی دھن میں لگے رہتے ہیں، کام کوئی چیز نہیں ہے، کیونکہ وہ منزل مقصود تک نہیں پہنچاتا - اتفاق و اتحاد بڑی چیز ہے، لیکن جہاں سب ایک دوسرے کے رقیب و حریف ہوں، وہاں اہل دانش کے نزدیک اِس سے احتراز ہی مناسب ہے - بعض لوگ یہاں ایسے تھے یا تقدیر کی رسائی سے پہنچ گئے تھے کہ جن میں انسانی ہمدردی اور قوت عمل کوٹ کوٹ کے بھری تھی - مگر جب اُنہوں نے یہاں کا رنگ دیکھا تو جلدی ہی سنبھل گئے اور جھک سے اہل جلسہ کے گروہ میں جا ملے - بعض نہیں مانے اور کام کرتے ہی گئے مگر یہاں کے اہل الرائے کا یہ خیال ہے کہ وہ کام نہ کرتے تو اُن کے حق میں زیادہ بہتر ہوتا - تجربہ بھی اِس کی شہادت دیتا ہے، ایسوں نے اکثر منہ کی کھائی ہے - عقل والوں

کی بلا دور، اُن کا اصول ہی دوسرا ہے - وہ کہتے ہیں کہ کام تو نہ کرو مگر کام کا شور بہت مچاؤ - لیکن اس کا نبھانا ہر ایک کا کام نہیں، کاغذ کی ناؤ کب تک چل سکتی ہے، ڈر رہتا ہے کہ کسی نہ کسی روز بھانڈا نہ پھوٹ جائے - جنھیں خلاق عالم نے عقل سے ذرا زیادہ بہرہ ور کیا ہے وہ اس جھگڑے میں نہیں پڑتے، اُن کے ڈھنگ ہی اور ہیں - وہ چپکے سے ایک انجمن بناکر کھڑی کر دیتے ہیں جو اشتراک عمل، اتحاد و اتفاق جیسے عیوب پر پردہ ڈال دیتی ہے - کام کا کام اور لطف کا لطف، "ہم خرما و ہم ثواب" - کام ہو نہ ہو انجمن تو ہے - دل ملیں نہ ملیں اجتماع تو ہے - کم سے کم تھوڑی دیر کے لئے ذاتی خیالات اور خواہشات سے الگ ہوکر گپ کا مزہ تو آ ہی جاتا ہے - حیدرآباد میں بہت سی انجمنیں بنیں اور بگڑیں، بعض کچھ دیر تک رہیں اور بعض بہت دیر تک - بعض نے تنگ آکر خود کُشی کرلی اور بعض سسک سسک کر رخصت ہوگئیں بعض کا نام ہی نام رہ گیا، اصل میں کچھ نہ تھیں - بعض اب بھی ہیں مگر نہونے سے بد تر - بہرحال انہوں نے کچھ نہ کچھ زندہ دلی پیدا کرنے کی کوشش کی اور آنے والوں کے لئے ایک اچھی نظیر چھوڑ گئیں --

"مجلس مذاکرۂ علمیہ" ایک نئی انجمن ہے اور نام بھی بہت شاندار ہے بعضے نام سنتے ہی آدمی مرعوب ہوجاتا ہے - اس میں خوش گپی کے ساتھ علمی ذوق کو بھی ملایا ہے - اگرچہ اب بھی بعض ارکان اسے محض خوش گپی ہی کے لئے مخصوص رکھنا چاہتے ہیں (اور سچ بھی ہے کہ حیدرآباد میں گپ کی فرصت ہی کہاں ملتی ہے) - اِن دونوں شقوں کا ساتھ ساتھ لے چلنا آسان کام نہیں ہے - مگر ہمیں اِس مجلس کے صاحب ذوق صدر نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی اور اس کے مستعد اور قابل معتمد مولوی سید ہاشمی صاحب سے یہ توقع ہے کہ یہ انجمن دیر تک سرسبز رہے گی اور اہل حیدرآباد میں علمی ذوق پیدا کرنے کی کوشش کرے گی اور جیسا کہ معتمد صاحب نے کیفیت میں فرمایا ہے ہماری بھی دلی تمنا ہے کہ "وہ صحیح معنوں میں علمی تحقیقات و اشاعت کا ایک بڑا مرکز بن جائے"---

ارکان کی تعداد محدود رکھی گئی ہے، لیکن یہ نہ معلوم ہوا کہ اس کا انتخاب کس اصول پر ہے - خوش گپی پر یا علمی ذوق پر - غالباً دونوں پر ہے ورنہ اگر کسی ایک پر ہوتا تو اس میں ایسے اصحاب بھی نظر آتے جو مجلس کے لئے باعث فخر ہوتے - ارکان کی کل تعداد پندرہ ہے ---

افسوس کہ یونیورسٹی اور دارالترجمہ ہوتے ہوئے بھی حیدرآباد میں کوئی اعلیٰ درجہ کی علمی مجلس نہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ اِن صاحبوں نے مجبور ہوکر اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائی ہے - کاش ارکان جامعہ اپنی نظر زیادہ بلند، اپنے دل زیادہ فراخ اور اپنے کام زیادہ وسیع کریں اور حیدرآباد میں علم کے دریا نہیں تو نالے تو بہادیں -

چند کتابوں کا پڑھا دینا یا چند کتابوں کا ترجمہ کر دینا کافی نہیں۔ شاید آب و ہوا یا ماحول کے بدلنے کا انتظار ہے —

اِن مذاکرات میں سات مضمون ہیں۔ جن میں سے ایک تو نواب صدر یار جنگ بہادر کی اردو غزل ہے۔ دوسرا مضمون ایک صفحے کا' نواب مسعود جنگ بہادر کی انگریزی نثر کا اردو ترجمہ ہے جس میں انہوں نے جاپان کی مدح میں شاعری فرمائی ہے اور اپنے ملک کو غیرت دلائی ہے۔ باقی پانچ میں سے تین کتابوں (تاج المآثر' جاویدان خرد' تحفۂ سامی) کے تبصرے ہیں۔ ایک مضمون نظریۂ اضافیت پر ڈاکٹر مظفرالدین قریشی (پروفیسر جامعۂ عثمانیہ) کا ہے اور ایک اندلس کے جغرافئے پر مولوی عنایت اللہ صاحب (ناظم دارالترجمہ) کا ہے —

اگرچہ بقول قابل معتمد "یہ پہلا مجموعہ مضامین کی کثرت یا تنوع کے اعتبار سے کچھ بہت بلند پایہ نہیں" مگر ہم خیال ارکان کے مختلف الخیال ہونے سے یہ توقع ہے کہ جو بیج اِس وقت بویا گیا ہے اُس کی فصل بہار بہت پر لطف اور شاندار ہونے والی ہے —

معتمد صاحب کی یہ اطلاع بھی ناظرین تک پہنچا دینا ہمارا فرض ہے کہ :-
"اس مجموعے کی عام اشاعت مقصود نہیں ہے۔ تاہم چند نسخے ارباب ذوق کے لیے رکھ لیے گئے ہیں اور یہ قیمت دو روپے فی نسخہ معتمد مجلس مذاکرہ دارلترجمہ حیدرآباد کے پتے سے مل سکتے ہیں" —

کتاب نہایت عمدہ' چکنے کاغذ پر چھپی ہے اور مجلد ہے —

نظریۂ اضافیت

(تالیف پروفیسر منہاج الدین صاحب ایم' ایس' سی - اسلامیہ کالج پشاور قیمت چار روپے۔ مجلد چار روپے بارہ آنے۔ غالباً مؤلف سے مل سکتی ہے) —

بقول پروفیسر صاحب موصوف کے : —

"زمانۂ حال کا سب سے حیرت انگیز کارنامہ آئن سٹائن کا نظریۂ اضافیت ہے' اس نظریے نے ہمارے تصورات اور قیاسات میں عجیب انقلاب پیدا کردیا ہے۔ فضاے بسیط غیر متناہی نہیں رہی - زمانہ اور طول مستقل ہونے کی بجاے اضافی حرکت پر منحصر - کمیت مادہ بھی رفتار سے اثر پذیر ہوتی ہے وغیرہ ذالک" —

فی الحقیقت نیوٹن اعظم مشہور انگریز سائنس داں (۱۶۴۲ء تا ۱۷۲۷ء) کے بعد دنیائے سائنس میں اگر کسی نے انقلاب پیدا کیا ہے تو آئنسٹائن ہے —

اس مسئلے نے مغربی دنیا میں تو وہ دلچسپی پیدا کردی کہ اس موضوع پر متعدد کتابیں شائع ہوئیں اور تقریباً ہر علمی رسالے یا اخبار میں اس پر مضامین نکلے - یہاں تک کہ امریکا کے ایک ہفتہ وار اخبار سائنٹفک امریکن) نے اس موضوع پر بہترین مضمون کے لئے ۵۰۰۰ ڈالر (تقریباً ۱۵۰۰۰ روپیہ) انعام مقرر کیا - جس شخص نے یہ انعام پایا اُس کا مضمون کتاب کی شکل میں شائع ہو چکا ہے - کتاب زیر تبصرہ میں اِس کتاب سے استفادہ بھی کیا گیا ہے —

مذکورۂ بالا امور سے مغرب کی دلچسپی کا اندازہ ہوسکتا ہے - اس کے مقابلے میں ہم اپنے یہاں کچھ پیش نہیں کر سکتے - تاہم اگر اس پر نظر رکھی جائے کہ مسئلے کو موجودہ شکل میں پیش ہوئے زیادہ زمانہ نہیں گیا ۱۹۰۵ء میں اس مسئلے نے موجودہ دعوے کی شکل اختیار کی، تو اُردو میں اِس خالص علمی موضوع پر کسی قابل قدر کتاب کا شائع ہوجانا مولف کی مستعدی اور باخبری کو ظاہر کرتا ہے اِس پر مولف مبارک باد کے مستحق ہیں - مولف نے کتاب کو چار مقالوں پر تقسیم کیا ہے :—

مقالۂ اول میں مبادی طبیعیات، دوم میں خاص نظریۂ اضافیت، سوم میں عام نظریۂ اضافیت، اور چہارم میں ماہیت عالم سے مبحث کی ہے —

مبادی طبیعیات میں دس باب قائم کئے ہیں اور ان میں وہ امور بیان کئے ہیں جن کے جانے بغیر نظریے کی اصطلاحات اور اس کا مفہوم بآسانی سمجھ میں نہیں آسکتا جس سادہ زبان اور سہل طریقے سے فاضل مولف نے ان مسائل کو بتلایا اور سمجھایا ہے وہ قابل تعریف ہے —

اگر کوئی شخص اِن مسائل سے بالکل ناواقف ہو تو وہ بھی دو ایک مرتبہ کے مطالعے سے اِن مطالب پر عبور حاصل کر سکتا ہے - مقام مسرت ہے کہ کتاب کی یہ خصوصیت از اول تا آخر قائم رکھی گئی ہے —

خاص "نظریۂ اضافیت" کو گیارہ بابوں میں بیان کیا ہے - اولاً اُن تجربات کا ذکر کیا ہے، جن پر اس نظریے کی بنیاد ہے، پھر نظریے کا دعویٰ ہے اور پھر جو اعتراض وارد ہوتے ہیں، اُن کا جواب ہے —

ڈاکٹر آئنسٹائن خود اس مسئلے کے متعلق تحریر فرماتے ہیں کہ: "ہم نے بلا کسی دلیل کے زمانے اور فضا کو مطلق مان لیا ہے" مگر یہ تصور صحیح نہیں ہے - زمانے اور فضا کے تصور کو بہ نظر غور دیکھا جائے تو ثابت ہو جاتا ہے کہ حقیقت میں اصول اضافیت

اور اصول اضافیت نور میں کوئی ناموافقت نہیں ہے - ان دونوں کے اصولوں کی بنا پر نہایت مستحکم اور مدلل نظریہ قائم ہوتا ہے جسے اضافیت کا نظریۂ خاص کہتے ہیں-

عام الفاظ میں اس نظریے کو یوں بیان کر سکتے ہیں :—

"عالم کی ترکیب ایسی واقع ہوئی ہے کہ ناظر اور اُس کے تمام آلات کی یکساں منظم حرکت کا کسی طبیعی عمل اور کسی قسم کے تجربے پر مطلق اثر نہیں ہوتا"۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر مرئی عالم کی تمام چیزیں کسی ایک سمت میں یکساں حرکت کے ساتھ جاری ہوں تو ہمیں کبھی اس حرکت کا علم نہ ہو گا- خواہ وہ کیسی ہی تیز کیوں نہ ہو - بس ہم نہیں معلوم کر سکتے کہ کائنات متحرک ہے یا ساکن-

اس اصول کو جب اصول استقلال نور سے ملاتے ہیں تو نہایت حیرت انگیز نتائج مرتب ہوتے ہیں —

اس مقالے میں جو خاص مسائل زیر بحث آئے ہیں اُن میں تین زیادہ اہم ہیں- ایک کمیت مادہ کا عدم استقلال دوسرے رفتار نور کا سب سے زیادہ ہونا تیسرے وقت کا بعد رابع ہونا —

کمیت مادہ اور رفتار کا باہم تعلق ہے حالانکہ اب تک اِن دونوں میں کوئی علاقہ نہ سمجھا جاتا تھا چنانچہ صفحہ ۱۴۴ پر ایک جدول درج ہے جس سے رفتار سے کمیت کی تبدیلی کا پتا چلتا ہے مثلاً:

اگر رفتار	۹۳۰۰۰	میل فی ثانیہ ہو	تو ایک سیر	کی کمیت میں	$\frac{1}{4}$	سیر کی زیادتی ہوگی
"	۱۶۱۰۰۰	"	"	"	۱	"
"	۱۸۶۰۰۰	"	"	"	لا متناہی	"

یہ آخری رفتار نور کی رفتار ہے جس سے زیادہ کسی شے کی رفتار ممکن ہی نہیں- جدول سے پتا چلتا ہے کہ بڑی بڑی رفتاروں ہی پر اضافیتی اثر مترتب ہوتا ہے - جن رفتاروں سے ہم کو روز مرہ سابقہ پڑتا ہے اُن پر کمیت مستقل ہی ہوتی ہے یعنی تبدیلی اتنی ہوتی ہے کہ ہم اس کی پیمائش نہیں کر سکتے - ممکن ہے کہ آئندہ ہم ایسے آلات ایجاد کر سکیں کہ روز مرہ کی زندگی میں بھی ہم اضافیتی اثر کو پیمائش کر سکیں —

اب تک دنیا مکان یا فضا کو اقلیدسی مانتی تھی یعنی جو نظام اقلیدس نے قائم کیا وہ صحیح ہے - اس نظام میں فضا کی پیمائش طول، عرض اور عمق کے تین بعدوں سے ہوتی ہے - لیکن نظریۂ اضافیت کی رو سے چونکہ زمان اور مکان علیحدہ علیحدہ نہیں بلکہ ایک دوسرے سے وابستہ ہیں اس لئے زمان چوتھا بعد قرار دیا گیا - چنانچہ

ایک ماہر فن نے آئنس ٹائن کا کارنامہ یہی بیان کیا ہے کہ اُس نے زمانے کو چوتھا بعد قرار دیا —

واضح رہے کہ نظری حیثیت سے چار سے بھی زیادہ بعد ہو سکتے ہیں - اس لئے تین بعدوں سے زیادہ بعد ہونا کسی محال کو مستلزم نہیں —

مقالۂ سوم میں عام نظریۂ اضافیت کو ۲۱ بابوں میں بیان کیا ہے -

نظریۂ عام کا دعویٰ یہ ہے کہ :

"قدرت کے قانون ایسی شکل میں بیان کئے جا سکتے ہیں جو کبھی تبدیل نہیں ہوتی - خواہ ہم اجسام کی حرکت کسی نظام کے حوالے سے بیان کریں" —

اب تک اس نظریہ سے قبل طبیعیات کے تین اساسی عناصر فضا، زمانہ اور مادہ قرار دیے جاتے تھے - نظریۂ خاص نے فضا اور زمانے کو ملا کر ایک واحد کائنات قائم کی - نظریۂ عام نے کائنات (فضا، زمانہ) اور مادے کی ترکیب سے اساسی طبیعی حقیقت قایم کی ہے - اس کے مطابق فضا، زمانہ اور مادہ فرداً فرداً تخئیلات ہیں اور طبیعی حقیقت ان تینوں کا مرکب ہے —

اس نظریے پر بھی بہت سے اعتراضات ہوے لیکن پروفیسر آئنس ٹائن نے ان سب کے معقول جواب دئے اور جتنے تجربے ہوتے ہیں نظریے کی تائید کرتے ہیں —

اس مقالے کا خاص مسئلہ اقلیدسی اور غیر اقلیدسی ہندسے کا فرق ہے - اقلیدسی ہندسہ سے مراد ہندسے کا وہ نظام جس کو اقلیدس نے قایم کیا تھا، جس میں فضا مستوی سمجھی جاتی ہے - لیکن غیر اقلیدسی ہندسہ فضا کو ہر مقام پر اقلیدسی یا مستوی ماننے کے لئے تیار نہیں - چنانچہ بعض حالتوں میں فضا منحنی بھی ہو جاتی ہے - اقلیدس نے متوازی خطوط کی تعریف یوں کی کہ "اُن کو ہر دو جانب کتنا ہی بڑھایا جاے وہ کبھی نہیں ملتے" - بعض استادان فن نے اس تعریف پر اعتراض کیا اور اسی سے غیر اقلیدسی ہندسے کی بنیاد پڑی - اس اعتراض کی تحقیق نے ایک نیا ہندسہ پیدا کر دیا، جس سے چوتھے بعد کا مفہوم حاصل ہوا - نظریۂ اضافیت جس سلسلے سے قایم ہوا اُس کی ایک کڑی یہ غیر اقلیدسی ہندسہ بھی ہے —

آخری مقالۂ چہارم میں ماہیت عالم کو چار بابوں میں بیان کیا ہے - سب سے آخر میں ایک تتمہ ہے جس میں نظریے پر اعتراضات اور اُن کے جوابات ہیں جو دلچسپ ہیں - اُن لوگوں کے لئے جو مسئلہ کے ریاضیاتی پہلو سے گریز کرنا چاہتے ہیں، یہی مقالہ سب سے زیادہ دلچسپ ہے —

سب سے پہلے مادے اور توانائی سے بحث کی ہے - اب تک طبیعیات میں کل کائنات کو دو اساس یعنی مادہ اور توانائی پر تقسیم کرتے تھے اور جملہ مظاہر طبیعی

کی توجیہ انھیں اساسوں کی اصالت سے ہوتی تھی لیکن اب عرصے سے فلسفی اور سائنس داں مادے اور توانائی پر بحث کرتے کرتے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مادہ اور توانائی الگ الگ نہیں بلکہ ایک ہی ہیں - توانائی متشکل ہو کر مادہ ہے - اس لئے عالم میں صرف ایک اساس یعنی توانائی ہے —

پھر ترتیب عالم سے بحث کی ہے اور دکھایا ہے کہ نظام انجم محدود ہے - اس طرح چوتھے باب میں یہ ثابت کیا ہے کہ عالم غیر محدود لیکن متناہی ہے - لیکن ہماری اصطلاح میں غیر محدود ہے ورنہ متناہی - آئنس ٹائن کی زبان میں خود اِس کی تشریح یہ ہے :-

" جب ہم یہ کہتے ہیں کہ فضا غیر متناہی ہے تو اُس سے ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ اگر ہم برابر حجم کے جسم اِس فضا میں رکھتے جائیں تو وہ فضا اُن سے کبھی پر نہ ہوگی۔ فرض کرو کہ ہمارے پاس لکڑی کے مکعب ہیں - اقلیدسی ہندسے کے بموجب ہم انھیں ایک دوسرے کے اوپر نیچے دائیں بائیں رکھ سکتے ہیں - مگر یہ ترتیب کبھی ختم نہ ہوگی - خواہ کتنے ہی مکعب رکھیں کچھ جگہ باقی رہے گی - پس فضا مکعبوں کے لیے غیر محدود ہے —

اب فرض کرو کہ ہمارے پاس کاغذ کے برابر برابر قرص موجود ہیں اور اُن کو کرے کی سطح پر چسپاں کرنا ہے - کروی سطح غیر محدود ہے لیکن متناہی ہے کیونکہ اگر ہم سطح پر کاغذ کے قرص چسپاں کردیں اور انھیں ایک دوسرے سے ملحق رکھیں تو آخر کار تمام سطح قرصوں سے بھرجائے گی اور کوئی جگہ باقی نہ رہے گی - یعنی کاغذ کی قرصوں کے لیے کروی سطح متناہی ہے" —

نظریۂ اضافت کے مطابق بھی فضا کروی ہے —

تکملے میں آٹھ اعتراض اور اُن کے جوابات درج ہیں - آخری اعتراض ایک مکالمے کی صورت میں ہے اور دلچسپ ہے —

شروع میں ایک مفصل فہرست بطور تجزیہ کے اور آخر میں انڈکس بھی درج ہے - جو کتاب کی ظاہری خصوصیات ہیں - فہرست اصطلاحات بھی دی ہے - بعض اصطلاحات فاضل مؤلف کی بنائی ہوئی ہیں اور بعض جامعہ عثمانیہ کی وضع کردہ ہیں - اور جہاں اُن اصطلاحوں سے اختلاف کیا ہے وہاں کچھ بہتر اصطلاحیں نہیں رکھیں - مثلاً Convection Current کے لیے ایصالی رو رکھا ہے حالانکہ Convection میں ایصال نہیں بلکہ حمل و نقل ہے —

Pitch کے لیے تعداد ارتعاش رکھا ہے - حالانکہ تعداد ارتعاش در اصل Frequency

ہے۔ اہل فن پر اِن ہر دو کا فرق ظاہر ہے۔ اِس لئے تعد د مناسب نہیں۔—

Projection کے لیے تسطیح رکھا ہے حالانکہ اس کا مفہوم "ظل اندازی" یا تظلیل ہے تسطیح سے وہ مفہوم پیدا نہیں ہوتا —

متن کی زبان اگرچہ صاف اور سادہ ہے تاہم بعض جگہ جملوں کی ترکیب کچھ نا مناسب ہے مثلاً :-

(۱) کتاب میں جا بجا "فرض کریں" استعمال کیا ہے۔ علمی مباحث میں مخاطب کے لیے یہ ترکیب مناسب نہیں۔ "فرض کرو" ہونا چاہئے—

(۲) صفحہ ۲۶ اور دیگر مقامات پر "مدور دائرے" استعمال کیا ہے حالانکہ "دائرۂ مدور" ہی ہوتا ہے —

(۳) صفحہ ۳۸ سطر ۵ :- "نیوٹن کے کلیے کے مطابق سیاروں کی آفتاب کے گرد گردش کی وجہ آفتاب کی قوت جاذبہ ہے"—
اِس کو اگر یوں ادا کرتے "نیوٹن کے کلیہ کے مطابق آفتاب کے گرد سیاروں کی گردش کی وجہ آفتاب کی قوتِ جاذبہ ہے" تو بہتر ہوتا —

(۴) صفحہ ۸۶ سطر ۶ :- "لیکن اجسام کی حرکت کا رفتار نور پر اثر ......" کی بجائے "رفتار نور پر اجسام کی حرکت کا اثر ......" زیادہ بہتر ہوتا—

کتاب میں ایسی ترکیبیں بہت آئی ہیں—

حاشیے پر جو ریاضی کے مسائل یا ثبوت متن کی تشریحیں دی ہیں اُن میں بھی بھرتی ہے۔ بہر حال بہ حیثیت مجموعی کتاب تعریف اور قدر کے لائق ہے اور اس قابل ہے کہ ہمارے علما خصوصاً وہ جو قدیم ریاضی سے دلچسپی رکھتے ہیں اس کتاب کا مطالعہ کریں اور جدید خیالات سے آگاہ ہوں —

(نصیر احمد)

زراعت عملی (حصۂ اول)

(مولفۂ خواجہ نفیس حسن صاحب انصاری' ایل۔ اے۔ جی۔ لکچرار زراعت و پولٹری فارمنگ وغیرہ' کالج زراعت کانپور۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ :- خواجہ طاہر حسن بک ڈپو (نواب گنج' کانپور) —

یہ کتاب بڑے کام کی معلوم ہوتی ہے - اسمیں باتیں نہیں بنائی ہیں اور نہ زیادہ الفاظ استعمال کئے ہیں - اس کا ہر لفظ بر محل اور کام کا ہے اور جو بات ہے وہ عملی زراعت کے متعلق ہے' ہر مہینے کی ہر تاریخ میں کیا کیا کام اور کیونکر ہونا چاہئے ، تفصیل سے بتایا ہے - دیہاتی کاموں کی لغت بھی لکھدی ہے - اس کے علاوہ پودوں کی نشو و نما پر اثر ڈالنے والے واقعات ' زرخیزی کے کم ہوجانے کے وجوہ اور علاج ' عامی زراعت کے بنیادی اصول ' بیجوں کے اُگنے کی قوت ' ہوا کی ضرورت اور اہمیت ' موسم اور موسمی قانون آب پاشی ' زمینوں میں پانی جذب کرنے کی مقدار ' آبپاشی کا وقت' کلونجیں کا بنانا اور خرچ وغیرہ وغیرہ بیسیوں مضامین پر بحث کی ہے --

---

فن پولٹری فارمنگ

(یا) پرندوں سے نفع اور آسائش - حصۂ اول (مولانا خواجہ نفیس حسن انصاری قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

یہ کتاب بھی زراعت عملی کے مؤلف کی ہے - اسمیں بھی اُنہوں نے نہایت تفصیل سے مرغیوں اور دوسرے پرندوں کے پالنے اور رکھنے ' اُن کی بیماریوں اور علاج ' مکان اور اخراجات وغیرہ کی تفصیل اپنی ذاتی تجربے اور غور کے بعد لکھی ہے اور جو لوگ تھوڑے سرمایہ سے پرندے پال کر نفع حاصل کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے بہت کار آمد ہے —

عربی طب پر ایک لکچر

(از جناب مولانا حافظ حکیم شمس الدین احمد صاحب - نامی پریس لکھنؤ)

یہ لکچر جناب حکیم صاحب نے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس لکھنؤ کے جلسے میں پڑھا تھا - عربی طب کی تاریخ پر بہت تحقیق سے بحث کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ عربوں نے اس فن کو کس رتبے تک پہنچایا اور اس میں کیا کیا ایجادیں کیں - جہاں اُنہوں نے یونان کی قدیم حکمت کو زندہ کیا وہاں اِس فن کو بھی عروج پر پہنچایا اور کئی صدی تک یورپ میں اِنہیں کی بدولت اِس طب کا بڑا اثر رہا - جو اصحاب اِس فن سے دلچسپی رکھتے ہیں ' اُنہیں اِس کا بغور مطالعہ کرنا چاہیئے —

خطبۂ صدارت

(بمبئی پریسیڈنسی مسلم لیڈیز ایجوکیشنل کانفرنس منعقدۂ پونہ۔
۲۵ اکتوبر سنہ ۱۹۲۶ء)

مسز خدیجہ شفیع طیب جی، جے۔ پی، بمبئی کی ایک تعلیم یافتہ اور روشن خیال خاتون ہیں۔ اس سال جو بمبئی مسلم لیڈیز ایجوکیشنل کانفرنس کا تیسرا سالانہ اجلاس پونہ میں ہوا تھا اُس کی صدر وہی تھیں اور یہ خطبہ اُسی اجلاس میں پڑھا گیا تھا۔ اس میں انھوں نے مسلمان لڑکیوں اور عورتوں کی تعلیم کے متعلق بعض ضروری مسائل پر بڑی لیاقت اور خوبی سے بحث کی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک تعلیم نسواں پر صرف مرد ہی بحث کیا کرتے تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ عورتوں کی تعلیم کے متعلق تعلیم یافتہ خواتین کی رائے زیادہ قابل غور ہے اور انہیں کو یہ حق ہے کہ وہ اپنی بہنوں کی تعلیم کے طریقے پر غور کریں، اس میں آسانیاں پیدا کریں اور اس کی ترقی کے لئے تدابیر سوچیں۔ اس میں دو مسئلے بہت اہم ہیں۔ ایک تو نصاب تعلیم اور دوسرا ذریعۂ تعلیم۔ اس میں اختلاف ہے کہ لڑکیوں اور لڑکوں کا نصاب تعلیم ایک ہی ہو یا مختلف۔ مسز طیب جی نے لڑکیوں کے جداگانہ نصاب کی تجویز پیش کی ہے اور اس میں انھوں نے علاوہ دوسرے مضامین کی تعلیم کے دست کاری، سوزن کاری، انتظام خانہ داری وغیرہ کی تعلیم بھی رکھی ہے جن کی لڑکیوں کے لئے خاص طور پر ضرورت ہے۔ موسیقی کے متعلق چونکہ اختلاف رائے ہے لہذا اسے انھوں نے اپنے نصاب میں اختیاری مضمون رکھا ہے مگر ساتھ ہی اس کی ضرورت اور خوبی پر بڑی صفائی سے بحث کی ہے۔ گرل گائڈ کی تحریک پر بھی، جو اخلاقی تعلیم اور صحت جسمانی کے لئے نہایت ضروری ہے، بہت زور دیا ہے۔ ترتیب نصاب کے لئے ایک کمیٹی قائم کرنے کی تجویز پیش کی ہے۔ اس مسئلے پر قابل صدر نے کسی قدر تفصیل سے بحث کی ہے کہ ثانوی تعلیم انگریزی میں دی جائے یا اردو میں۔ اُن کی رائے میں یہ تعلیم اردو زبان ہی میں ہونی چاہئے کیونکہ جو مضامین لڑکیاں اپنی مادری زبان میں سیکھیں گی وہ اُن کے ذہن نشین ہو کر یاد رہیں گے اور اس سے اُن کے معلومات میں بہت اضافہ ہوگا اور مدرسہ چھوڑنے کے بعد خانگی طور پر اپنا علم بڑھانے میں زیادہ کامیاب ہوں گی۔ اور حقیقت ہے کہ جب تک مائیں اپنی زبان میں تعلیم حاصل کر کے اپنے معلومات وسیع نہ کریں گی اُن کے بچوں میں کبھی لکھنے پڑھنے کا ذوق پیدا نہیں ہو سکتا —

اس خطبے میں انھوں نے ایک نقشہ دیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک ہزار

عورتوں میں صرف بارہ لکھی پڑھی ہیں اور باقی نو سو اٹھاسی جاہل مطلق ہیں اور اس بنا پر انہوں نے یہ راے دی ہے کہ مسلمانوں کو سب قوموں سے زیادہ جبری تعلیم کی ضرورت ہے —

شادی شدہ عورتوں کے لئے تعلیم، کتب خانوں اور میل جول کی مجلسوں کی بہت ضرورت بتائی ہے - پردے کے متعلق اُن کا مسلک میانہ روی کا ہے - اُن کی راے ہے کہ ہم پردے کو ترک نہیں کر سکتے مگر ہندوستان کا موجودہ پردہ شرعی پردہ نہیں ہے —

جو اصحاب اور خواتین تعلیم نسواں کے مسئلے سے دلچسپی رکھتے ہیں انہیں یہ خطبہ غور سے پڑھنا چاہئے اور اُن مفید تجاویز کو عمل میں لانے کی کوشش کرنی چاہئے جو مسز طیب جی نے پیش کی ہیں —

رپورٹ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس بابتہ سنہ ۱۹۲۵ع

اس کانفرنس کا سالانہ اجلاس گزشتہ سال علی گڈھ کالج کی جوبلی کے موقع پر علی گڈھ میں منعقد ہوا تھا - اس میں اس اجلاس کی مفصل کارروائی درج ہے - تعلیم کا مسئلہ ایسا ہے جو کبھی پرانا نہیں ہو سکتا بلکہ ہر زمانے میں اس میں نئی شگفتگی اور جدت پیدا ہوتی رہتی ہے اور اس لئے حالات و واقعات کے لحاظ سے اس پر غور کرنے اور اس میں مناسب تبدیلیاں پیدا کرنے کی ضرورت واقع ہوتی رہتی ہے - اب بھی وقت ہاتھ سے نہیں گیا ہے کہ یہ کانفرنس اپنے طریق عمل میں مناسب تغیر و تبدل کر کے اسے مسلمانوں کے لئے حقیقی طور پر مفید بنائے - یہ کانفرنس ایک بڑی قوت ہو سکتی ہے بشرطیکہ اس سے استقلال، پیش بینی، محنت اور لیاقت سے کام لیا جاے —

نقشۂ مقامات مقدسہ و عالم اسلام

(تقطیع ۳۰ × ۴۰ قیمت مجلد بغیر اسٹر و بے روغن ۳ روپے، روغنی بلا جلد ۲ روپے روغنی مع رول لکڑی ۳ روپے ۸ آنے - ملنے کا پتہ — عبدالرحیم صاحب نبیرۂ ابراہیم صاحب فیتہ والے، محلہ ابراہیم پورہ، کورلا، متصل بمبئی)

یہ نقشہ مقامات مقدسہ و عالم اسلام مع نقشۂ جزیرۃالعرب و حجاز و بغداد ریلوے بہت صفائی اور سلیقے کے ساتھ تیار کیا گیا ہے - طلبہ نیز عام شائقین کے لئے بہت کار آمد ہے —

اُردو کے جدید رسالے

ہمیں خیال تھا کہ اُردو رسالے جو اس عرصے میں دیکھا دیکھی چل نکلے ہیں، یہ بھی، ایک بہار کی سی فصل ہے۔ چند روز میں اِن پر خزاں چھا جائے گی، لیکن شکر ہے کہ ہمارا یہ خیال غلط ہوتا نظر آتا ہے۔ اگر دو چار بند ہوجاتے ہیں تو دو تین نئے بھی نکل آتے ہیں۔ بہر حال یہ شوق قابل تعریف ہے، لوگوں میں اِس سے مطالعہ اور انشا پردازی کا شوق پیدا ہوگا اور زبان کو ترقی ہوگی۔ چند نئے رسالے جو اس دو تین مہینے کی مدت میں ہمیں وصول ہوے ہیں، اُن کا ذکر خیر یہاں کیا جاتا ہے۔

آفتاب

یہ رسالہ کلکتہ سے اسی سال شایع ہوا ہے۔ کلکتہ بھی ایک زمانے میں اردو کا مرکز رہا ہے، بلکہ ایک طرح سے جدید اردو نثر کی بنا وہیں پڑی۔ ہمیں اس سے خوشی ہوئی کہ وہاں سے ایسا اچھا رسالہ شایع ہوا ہے۔ ہمارے سامنے اپریل اور مئی کا اکھٹا پرچہ ہے۔ ادبی مضامین کے علاوہ چار تصویریں بھی بہت اچھی دی ہیں۔ ایک شاہ جہاں کی تصویر زمانۂ اسیری کی ہے اور ایک نور جہاں کے بچپن کی ہے، لیکن یہ نہیں بتایا کہ یہ تصویریں کہاں سے دستیاب ہوئیں۔ رسالے میں حب وطن یعنی حب صوبہ کی بو بھی آتی ہے۔ یہ ہم تعریض کے طور پر نہیں کہتے بلکہ ہمیں اس سے حقیقی مسرت ہوتی ہے کہ ہر صوبے کو یہ دعویٰ ہے کہ اُس نے اردو کی ترقی میں حصہ لیا ہے۔ چنانچہ رسالے کے اس نمبر میں بنگالہ اور بہار کے بعض شعرا اور ادبا کا ذکر فخر سے کیا گیا ہے۔ بہر حال یہ رسالہ اپنے بہت سے ہم عصروں سے کسی طرح کم نہیں اور پڑھنے کے قابل ہے۔ اس کے اڈیٹر چراغ حسن صاحب (حسرت) ہیں۔ سالانہ چندہ صرف دو روپے بارہ آنے ہے۔ جو اس کی خوبیوں کے مقابلے میں بہت کم ہے۔

ادبستان

(اڈیٹر: رشید صدیقی صاحب - معاون: سلیم اللہ آبادی و خلیل احمد سہکروی - قیمت سالانہ چار روپے بمبئی)

ہم ابھی کلکتے کے ایک رسالے کا ذکر کر چکے ہیں۔ یہ ماہوار رسالہ بمبئی سے انجمن معین الادب نے شایع کیا ہے۔ بہی خواہان اردو کے لئے امر موجب مسرت ہوگا کہ ہندوستان کے سب سے دو بڑے شہروں میں اردو کا شوق بڑھتا جاتا ہے۔ اس رسالے میں جو پہلا نمبر ہے لائق اڈیٹروں نے دلچسپی کا سامان جمع کیا ہے اور علاوہ نظم و نثر کے مضامین اور افسانوں کے، تصویروں کا بھی اہتمام کیا ہے۔ لکھنے والوں میں چند خوانین بھی ہیں۔ امید ہے کہ اہل بمبئی اس کی قدر کریں گے —

تحفہ

(اڈیٹر: محمد عبدالغفار خاں صاحب، معرفت ندوہ سرائے اعظم گڈھ۔ سالانہ قیمت چار روپے، سانڈلے، برھما)

خیر کلکتے اور بمبئی سے اردو رسالوں کا نکلنا تو کچھ زیادہ تعجب خیز بات نہ تھی۔ مگر سانڈلے (برھما) سے اردو رسالے کا شایع ہونا ضرور تعجب اور خوشی کا موجب ہے۔ اس رسالہ میں دینی، تاریخی، ادبی مضامین کے علاوہ غزلیں، لطائف و ظرائف اور ناول کا بھی حصہ ہے۔ برھما سے ایسے رسالے کا نکلنا بہت غنیمت اور قابل قدر ہے۔ اور سب سے زیادہ خوشی اس بات سے ہوئی کہ برھمی ابن بادی نوجوان کی بھی غزل اس میں درج ہے۔ اس غزل کو پڑھ کر حیرت ہوئی کہ خاص برھما کا ایک نوجوان ایسی فصیح زبان لکھ سکتا ہے۔ امید ہے کہ وہ اپنے تخیل کی جولانی غزل ہی تک محدود نہ رکھیں گے۔ افسوس ہے کہ رسالے کی چھپائی اچھی نہیں ہے —

زبان

ایڈیٹر: عبدالرحمٰن خوشتر (منگرولی)۔ سالانہ قیمت چار روپے۔ منگرول، کاٹھیاو

یہ رسالہ ایسے مقام سے شایع ہوا ہے، جہاں کی زبان گجراتی ہے۔ ہم خوشتر صاحب کو اُن کی سعی پر مبارک باد دیتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ یہ نیا رسالہ کامیابی کے ساتھ جاری رہے گا۔ علمی اور ادبی مضامین کے لحاظ سے رسالہ قابل قدر ہے۔ مضامین کے ساتھ لکھائی، چھپائی بھی اچھی ہے۔ گجرات بھی ایک زمانے میں اردو زبان کا مرکز رہا ہے، کیا تعجب ہے کہ جناب خوشتر اور پروفیسر نواب علی صاحب جیسے صاحب ذوق حضرات کی بدولت اس کا چرچا پھر اس خطے میں ہونے لگے۔ ہم بھی فاضل پروفیسر کے ہم نوا ہیں کہ:-

مٹنے کی نہیں ہے کبھی گجرات میں اُردو

کائنات

ایڈیٹر: شیخ محمد اسمٰعیل صاحب۔ سالانہ قیمت دو روپے۔ پانی پت)

شیخ محمد اسمٰعیل صاحب پانی پتی جنھوں نے حال میں مولانا حالی کا کلام مرتب کیا ہے، اس قسم کے کاموں کے لیے بہت موزوں ہیں۔ اس سے قبل انھوں نے "جام جہاں نما" نامی رسالہ شایع کیا تھا۔ معلوم نہیں وہ کیوں بند ہوگیا۔ بہر حال اِسے اُس کا قائم مقام سمجھنا چاہئے۔ رسالہ بہت دلچسپ ہے اور علاوہ دوسرے معلومات کے ایک مسلسل ناول بھی شایع ہو رہا ہے۔ قیمت کے لحاظ سے بھی رسالہ بہت قابل قدر ہے۔

مرقع ادب

(مدیر: حضرت فیروز شہزاد پوری۔ معاون مدیر: حضرت بیتاب سوہانوی۔ مدیر نسائیات: واحدہ سلطان خانم، سالانہ قیمت دو روپے۔ انبالہ صدر)

فرصت ہو تو دل چسپی کے لئے یہ رسالہ بھی خوب ہے۔ اگر چھپائی کی صفائی کی طرف زیادہ توجہ کی جائے تو اِس کی خوبی اور بڑھ جائے۔ نظموں اور قصوں کے ساتھ خیالی مضامین زیادہ ہیں —

مصلح

اڈیٹر بابا خلیل احمد (داس) چکروبدی سیواں ضلع سارن بہار ا
سالانہ قیمت تین روپے

یہ رسالہ اپنی قسم کا ایک ہی ہے۔ شروع میں وید منتروں کا ترجمہ اور اُن کی تفسیر و تشریح درج ہے۔ علاوہ اِس کے اسلامی مضامین ہیں اور اسلام کے خلاف آریہ سماجی جد و جہد کا ذکر ہے۔ غرض یہ ایک مذہبی رسالہ ہے جس میں مناظرے کا انداز پایا جاتا ہے—

تجارت

(اڈیٹر قاضی محمد عطاء اللہ ندوی۔ سالانہ چندہ چار روپے۔ بمبئی) -

---

ایسا اخبار بمبئی ہی سے کامیابی کے ساتھ نکل سکتا ہے۔ اس میں تجارتی اور صنعتی مضامین کے ساتھ عام مضامین اور عام خبریں بھی درج ہوتی ہیں۔ اور تصویروں کا بھی اہتمام کیا گیا ہے۔ لیکن تجارت کے متعلق جب تک عملی اور کار آمد نکتے نہ بتائے جائیں محض مضامین کافی نہیں ہوسکتے۔ بہر حال یہ بھی غنیمت ہے—

مطبوعات انجمن

جاپان اور اس کا تعلیمی نظم و نسق
سرکار نظام نے نواب مسعود جنگ بہادر ناظم تعلیمات ممالک محروسہ سرکار عالی کو جاپان کے تعلیمی نظام کے مطالعہ اور تحقیق کے لیے بھیجا تھا۔ نواب صاحب موصوف نے وہاں رہ کر اس عجیب و غریب ملک کے حالات اور خاص کر تعلیمی نظم و نسق کو نہایت غور اور تحقیق سے مطالعہ فرمایا۔ کتاب کے ابتدائی حصے میں جاپان کی تاریخ اور اس کی ترقی کے اسباب پر نہایت دلچسپ اور فاضلانہ بحث کی ہے۔ جو ہمارے اہل وطن کے لیے بہت سبق آموز ہے۔ اردو میں یہ پہلی کتاب ہے جو جاپان پر اس طرز میں لکھی گئی ہے۔ ہر محب وطن کا فرض ہے کہ اس کتاب کو شروع سے آخر تک پڑھے۔ جو علاوہ دلچسپ ہونے کے پر از معلومات ہے۔ خاص کر ان لوگوں کے لئے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے جو ملک کی تعلیم سے تعلق رکھتے ہیں (حجم ۴۸۲ صفحہ)
قیمت فی جلد مجلد تین روپیہ کلدار

سرگزشت حیات یا آپ بیتی
اس کتاب میں حیات کے آغاز اور اس کے نشوونما کی داستان نہایت دلچسپ طرز پر بہت ہی سلیس زبان میں بیان کی گئی ہے۔ حیات کی ابتدائی حالت سے لے کر اس کا ارتقا انسان تک پہنچایا گیا ہے اور تمام تاریخی مدارج کو اس سہل طریقہ سے بتایا گیا ہے کہ ایک معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی سمجھ سکے اور اگرچہ جدید سے جدید علمی تحقیقات بھی اس میں آگئی ہے مگر بیان کی سلاست میں فرق نہیں آیا — یہ کتاب جدید معلومات سے لبریز ہے اور ہر شخص کو اس کا مطالعہ کرنا لازم ہے
(حجم ۳۰۰ صفحہ)
قیمت فی جلد مجلد دو روپیہ آٹھ آنہ کلدار —

تذکرۂ شعرائے اردو
مولفہ میر حسن دہلوی۔ میر حسن کے نام سے کون واقف نہیں۔ اُن کی مثنوی بدر منیر کو جو قبول عام نصیب ہوا شاید ہی اردو کی کسی کتاب کو نصیب ہوا ہو۔ یہ تذکرہ اسی مقبول اور نامور استاد کی تالیف ہے۔ یہ کتاب بالکل نایاب تھی بڑی کوشش سے بہم پہونچا کر طبع کی گئی ہے میر صاحب کا نام اس تذکرہ کی کافی شہادت ہے۔ اس پر مولانا محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی نے ایک بسیط نقادانہ اور عالمانہ تبصرہ لکھا ہے جو قابل پڑھنے کے ہے۔ قیمت فی جلد مجلد ایک روپیہ ۱۴ آنہ کلدار — غیر مجلد ایک روپیہ ۶ آنہ کلدار —

تاریخ تمدن
سر ٹامس بکل کی شہرۂ آفاق کتاب کا

ترجمہ ہے - الف سے ی تک تمدن کے ہر مسئلہ پر کمال جامعیت سے بحث کی گئی ہے اور ہر اصول کی تائید میں تاریخی اسناد سے کام لیا گیا ہے اس کے مطالعہ سے معلومات میں انقلاب اور ذہن میں وسعت پیدا ہوتی ہے - حصۂ اول غیر مجلد ایک روپیہ ۸ آنہ مجلد دو روپیہ کلدار حصۂ دوم مجلد ۲ روپیہ کلدار —

مقدمات الطبیعات

یہ ترجمہ ہے مگر انگلستان کے مشہور سائنس داں حکیم ہکسلے کی کتاب کا جس کا نام کتاب کی کافی ضمانت ہے - اس میں بظاہر فطرت کی بحث درج ہے لیکن کتاب علم و فضل کا مرقع ہے - قیمت غیر مجلد دو روپیہ کلدار — مجلد دو روپیہ ۸ آنہ کلدار —

القول الاظہر

امام ابن مسکو یہ کی معرکۃ الآرا تصنیف فوز الاصغر کا یہ اردو ترجمہ ہے - یہ کتاب فلسفۂ الہیین کے اصول پر لکھی گئی ہے اور مذہب اسلام پر انہیں اصول کو منطبق کیا گیا ہے - قیمت غیر مجلد ۸ آنہ کلدار - مجلد ایک روپیہ کلدار —

القمر

قوانین حرکت و سکون اور نظام شمسی کی صراحت کے بعد چاند کے متعلق جو جدید انکشافات ہوے ہیں ان سب کو جمع کردیا ہے طرز بیان دلچسپ اور کتاب ایک نعمت ہے - قیمت غیر مجلد ۱۰ آنہ کلدار - مجلد ۱ روپیہ کلدار —

قاعدہ۲ و کلید قاعدہ۲

یہ قاعدہ۲ مدت کے غور و خوض کے بعد اور بالکل جدید طرز پر لکھا گیا ہے جن اصول اور طریقہ پر اس کی تعلیم ہونی چاہئے ان کی تشرح کے لئے ایک کلید بھی تیار کی گئی ہے - قاعدہ۲ غیر مجلد ۲ آنہ کلدار - کلید قاعدہ۲ غیر مجلد ۴ آنہ کلدار —

فلسفۂ تعلیم

ہر برٹ اسپنسر کی مشہور تصنیف اور مسئلۂ تعلیم کی آخری کتاب ہے - غور و فکر کا بہترین کارنامہ - والدین و معلم کے لئے چراغ ہدایت ہے - تربیت کے قوانین کو اس قدر صحت کے ساتھ مرتب کیا ہے کہ کتاب الہامی معلوم ہوتی ہے - اس کا نہ پڑھنا گناہ ہے - قیمت مجلد ۲ روپیہ کلدار - غیر مجلد ایک روپیہ ۱۲ آنہ کلدار —

دریاے لطافت

ہندوستان کے مشہور سخن سنج میر انشاالله خاں کی تصنیف ہے - اردو صرف و نحو اور محاورات اور الفاظ کی پہلی کتاب ہے اس میں زبان کے متعلق بعض عجیب و غریب نکات درج ہیں - قیمت غیر مجلد ایک روپیہ ۸ آنہ کلدار - مجلد ۲ روپیہ کلدار —

طبقات الارض

اس فن کی پہلی کتاب ہے - تین سو صفحوں میں تقریباً جملہ مسائل

قلم بند کئے ہیں۔ کتاب کے آخر میں انگریزی مصطلحات اور ان کے مرادفات کی فہرست بھی منسلک ہے۔ قیمت غیر مجلد ۲/ روپیہ کلدار مجلد ۲ روپیہ ۸ آنہ کلدار—

مشاہیر یونان و رومہ

ترجمہ ہے۔ سیرت نگاری اور انشاپردازی میں اصل کتاب کا مرتبہ دو ہزار برس سے آج تک مسلم الثبوت چلا آتا ہے۔ ادیبان عالم بلکہ شکسپیر تک نے اس چشمہ سے فیض حاصل کیا ہے۔ وطن پرستی اور بے نفسی عزم و جواں مردی کی مثالوں سے اس کا ہر ایک صفحہ معمور ہے۔ قیمت جلد اول غیر مجلد ۳ روپیہ کلدار۔ مجلد ۴ روپیہ کلدار جلد دوم مجلد ۲ روپیہ ۸ آنہ کلدار

اسباق النحو

ملک کے ادیب کامل مولانا حمید الدین صاحب بی اے کی تالیف ہے۔ اختصار کے باوجود عربی صرف و نحو کا ہر ایک ضروری مسئلہ درج ہے۔ قیمت حصۂ اول غیر مجلد ۶ آنہ کلدار۔ حصۂ دوم غیر مجلد ۴ آنہ کلدار—

علم المعیشت

اس کتاب کی تصنیف سے پروفیسر محمد الیاس صاحب برنی ایم اے نے ملک پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ معیشت پر یہ کتاب جامع و مانع ہے۔ مبہم و مشکل مسائل کو پانی کر دیا ہے اس کے اکثر باب نہایت عجیب و غریب ہیں۔ اشتراکیت کا باب قابل دید ہے (حجم ۸۸۵ صفحے) قیمت مجلد ۵ روپیہ ۸ آنہ کلدار—

تاریخ اخلاق یورپ

اصل مصنف پروفیسر لیکی کا نام علم و تبحر۔ تحقیق و صداقت کا مرادف ہے۔ یہ کتاب کئی ہزار برس کے تمدن معاشرت۔ اصول۔ اخلاق۔ مذاہب و خیالات کا مرقع ہے۔ حصۂ اول مجلد ۳ روپیہ کلدار۔ حصۂ دوم مجلد ۲ روپیہ ۸ آنہ کلدار—

تاریخ یونان قدیم

یہ کتاب مطالب کے لحاظ سے مستند کتابوں کا خلاصہ ہے اور زبان کے لحاظ سے سلاست و شگفتگی کا نمونہ۔ اس کا نقطۂ خیال خالصاً ہندوستانی ہے۔ ایف اے کلاس کے طلبا جو یونان قدیم کی تاریخ سے گھبراتے ہیں اس کتاب کو انتہا درجہ مفید پائیں گے۔ قیمت مجلد ۲ روپیہ کلدار—

انتخاب کلام میر

میر تقی میر تاج شعرائے اردو کے کلام کا انتخاب ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو نے یہ انتخاب ایک مدت کی سعی و محنت کے بعد کیا ہے اور شروع میں میر صاحب کی خصوصیات شاعری پر ۴۰ صفحہ کا ایک عالمانہ مقدمہ بھی لکھا ہے۔ قیمت مجلد ۲ روپیہ کلدار—

رسالۂ نباتات

اس موضوع کا پہلا رسالہ ہے - علمی اصطلاحات سے معرا - طلباء نباتات جس مسئلہ کو انگریزی میں نہ سمجھہ سکیں وہ اس رسالہ میں مطالعہ کریں - قیمت مجلد ایک روپیہ چار آنہ کلدار —

دیباچۂ صحت

اس کتاب میں مطالبات صحت پر (مثلاً ہوا - پانی - غذا - لباس - مکان وغیرہ) مبسوط اور دلچسپ بحث کی گئی ہے - زبان عام فہم اور پیرایہ موثر و دلپذیر ہے ملک کی بہترین تصنیف ہے - اس کا مطالعہ کئی ہزار نسخوں سے زیادہ قیمتی ثابت ہوگا - حجم ایک ہزار صفحے - قیمت مجلد چار روپیہ کلدار —

قواعد اردو

ارباب فن کا اتفاق ہے کہ اردو زبان میں اس سے بہتر قواعد نہیں لکھے گئے - بسط و شرح کے علاوہ اس میں بڑی خوبی یہ ہے کہ فارسی قواعد کا تتبع نہیں کیا گیا ہے قیمت غیر مجلد دو روپیہ کلدار —

نکات الشعراء

یہ اردو کا تذکرہ استادالشعرا میر تقی مرحوم کی تالیفات سے ہے - اس میں بعض ایسے شعرا کے حالات بھی ملیں گے جو عام طور پر معروف نہیں - نیز میر صاحب کی رائیں اور زبان کے بعض بعض نکات پڑھنے کے قابل ہیں - مولانا محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی صدرالصدور امور مذہبی سرکار عالی نے اس پر ایک ناقدانہ اور دلچسپ مقدمہ لکھا ہے - قیمت مجلد ایک روپیہ ۲ آنہ کلدار —

فلسفۂ جذبات

کتاب کا مصنف ہندوستان کا مشہور نفسی ہے - جذبات کے علاوہ نفس کی ہر ایک کیفیت پر نہایت لیاقت اور زبان آوری کے ساتھہ بحث کی گئی ہے - متعلمان نفسیات اسے مفید پائیں گے قیمت مجلد دو روپیہ ۸ آنہ کلدار غیر مجلد دو روپیہ کلدار —

وضع اصطلاحات

یہ کتاب ملک کے نامور انشاپرداز اور عالم مولوی وحیدالدین سلیم (پروفیسر عثمانیہ کالج) نے سالہا سال کے غور و فکر اور مطالعہ کے بعد تالیف کی ہے بقول فاضل مولف "یہ بالکل نیا موضوع ہے - میرے علم میں شاید کوئی ایسی کتاب نہ آج تک یورپ کی کسی زبان میں لکھی گئی ہے نہ ایشیا کی کسی زبان میں" - اس میں وضع اصطلاحات کے ہر پہلو پر تفصیل کے ساتھہ بحث کی گئی ہے اور اس کے اصول قائم کیے گئے ہیں - مخالف و موافق رایوں کی تنقید کی گئی ہے اور زبان کی ساخت اور اس کے عناصر ترکیبی - مفرد و مرکب اصطلاحات کے طریقے - سابقوں اور لاحقوں - اردو مصادر اور ان کے

مشققتات - غرض سیکڑوں دلچسپ اور علمی بحثیں زبان کے متعلق آگئی ہیں۔ اُردو میں بعض اور بھی ایسی کتابیں ہیں جن کی نسبت یہ کہا جاسکتا ہے کہ زبان میں ان کی نظیر نہیں۔ لیکن اس کتاب نے زبان کی جڑیں مضبوط کردی ہیں۔ اور ہمارے حوصلے بلند کردیے ہیں۔ اس سے پہلے ہم اردو کو علمی زبان کہتے ہوے جھجکتے اور اس کی آئندہ ترقی کے متعلق دعوی کرتے ہوے ہچکچاتے تھے۔ مگر اس کتاب کے ہوتے یہ اندیشہ نہیں رہا۔ اس نے حقیقت کا ایک نیا باب ہماری آنکھوں کے سامنے کھول دیا ہے۔ تعداد صفحات ۳۰۵ - قیمت مجلد تین روپیہ ۱۲ آنہ کلدار —

نفح الطیب

یہ کتاب اسلامی عہد کی تاریخ اسپین کے معلومات کا خزانہ ہے۔ خلافت اسپین کے ہر مورخ کو اس کی خوشہ چینی کرنی پڑی ہے۔ علامۂ مقری کی نامور اور مشہور آفاق کتاب ہے - جو پہلی دفعہ اردو میں ترجمہ ہوئی ہے۔ یہ کتاب عثمانیہ یونیورسٹی کے نصاب میں بھی داخل ہے۔ صفحات ۶۰۳ قیمت مجلد چھہ روپیہ ۸ آنہ کلدار —

محاسن کلام غالب

ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری مرحوم کا معرکۃ الآرا مضمون ہے۔ اُردو زبان میں یہ پہلی تحریر ہے جو اس شان کی لکھی گئی ہے - یہ مضمون اردو کے پہلے نمبر میں طبع ہوا تھا۔ صاحب نظر قدر دانوں کے اصرار سے الگ بھی طبع کیا گیا ہے - قیمت غیر مجلد ۸ آنہ کلدار —

ملل قدیمہ

ایک فرانسیسی کتاب کا ترجمہ ہے - اس میں بعض قدیم اقوام ' سلطنت کلدانی ' آشوری ' بابل - بنی اسرائیل و فنیقیہ کی معاشرت - عقائد - اور صنعت و حرفت وغیرہ کے حالات دلچسپی اور خوبی کے ساتھہ دیے ہیں۔ اُردو میں کوئی ایسی کتاب نہ تھی جس سے ان قدیم اقوام کے حالات صحیح طور سے معلوم ہوسکیں اس لیے انجمن نے اسے خاص طور پر طبع کرایا ہے۔ حالات کی وضاحت کے لیے جابجا تصویریں دی گئی ہیں۔ صفحہ ۲۷۴ قیمت مجلد دو روپیہ ۶ (چھہ) آنہ کلدا —

بجلی کے کرشمے

یہ کتاب مولوی محمد معشوق حسین خانصاحب بی۔اے نے مختلف انگریزی کتابوں کے مطالعہ کے بعد لکھی ہے۔ برقیات پر یہ ابتدائی کتاب ہے اور سہل زبان میں لکھی ہے۔ ہمارے بہت سے ہم وطن یہ نہیں جانتے کہ بجلی کیا چیز ہے ' کہاں سے آتی ہے ' کیا کام آسکتی ہے۔ یہ کتاب ان تمام معلومات کو بتاتی ہے۔ لڑکے لڑکیوں کے لیے بڑی مفید ہے۔ قیمت دو روپیہ ۴ آنہ کلدار —

حسب ذیل کتابیں بھی انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن سے مل سکتی ھیں:—
(کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ھیں)

۱

(دارالمصنفین اعظم گڑھ)

سیرۃ النبی حصۂ اول ۴ روپیہ
سیرۃ النبی حصۂ دوم ۳ روپیہ ۸ آنہ
سیرۃ النبی حصۂ سوم ۶ روپیہ
شعر العجم مکمل ۵ حصے ۱۳ روپیہ
سفر نامۂ مولانا شبلی ۲ روپیہ
علم الکلام ۲ روپیہ
الکلام ۲ روپیہ
کلیات شبلی ۱ روپیہ ۸ آنہ
اسوۂ صحابہ مکمل دو حصے ۸ روپیہ
انقلاب الامم ۲ روپیہ
برکلے ۱ روپیہ ۸ آنہ
مکالمات برکلے ۱ روپیہ ۸ آنہ
مثنوی بحر المحبت ۱۲ آنہ
تفسیر ابو مسلم اصفہانی (عربی) ۲ روپیہ
سیر الصحابیات ۲ روپیہ ۴ آنہ
روح الاجتماع ۲ روپیہ
ابن رشد ۴ روپیہ
گل رعنا ۵ روپیہ
سیر الانصار ۳ روپیہ ۸ آنہ
شعر الہند مجلد ۵ روپیہ
شعر الہند غیر مجلد ۴ روپیہ

(مطبع کاویانی - برلن)

زاد المسافرین (فارسی) ۸ روپیہ
گلستان فارسی ۲ روپیہ
تیاتر (فارسی) ۲ روپیہ ۸ آنہ
تاریخ سنی ملوک الارض (عربی)
۲ روپیہ ۸ آنہ
نصاب الصبیان (فارسی) ۱ روپیہ
رہنمائے پسران (فارسی) ۱ روپیہ
۸ آنہ
تلغراف بی سیم (فارسی) ۱ روپیہ
ہزار ویک سخن (فارسی) ۱۱ آنہ

(جامعہ ملیہ دہلی)

الخلافۃ الکبریٰ ۵ روپیہ
الصراط المستقیم ۲ روپیہ
بصائر ۶ آنہ
سیرۃ الرسول ۱ روپیہ ۸ آنہ
خلافت راشدہ ۲ روپیہ
خلافت بنی امیہ ۱ روپیہ ۸ آنہ
خلافت عباسیہ ۴ روپیہ
خلافت عباسیۂ بغداد ۲ روپیہ
مبادی معاشیات ۱ روپیہ
انتخاب کلام میر (از نور الرحمن صاحب)
۱ روپیہ
قواعد عربی ۲ روپیہ
عرض جوہر ۸ آنہ
مجموعہ کلام جوہر ۶ آنہ
اسلامی تہذیب و قومی تعلیم ۴ آنہ
ازہار العرب (عربی) ۸ آنہ

انتخاب مضامین جوہر ۱ روپیه
ترکوں کی کہانیاں ۴ آنه
خطبۂ شیخ الہند ۲ آنه
خطبۂ حکیم اجمل خاں صاحب ۲ آنه
ہمارے نبی ۸ آنه
تاریخ ہند قدیم ۱ روپیه
اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر
۱۲ آنه

(نظامی پریس - بدایوں)

قاموس المشاہیر جلد اول ۶ روپیه
نکات غالب مجلد ۱ روپیه
دیوان غالب مشرح مجلد ۲ روپیه
۸ آنه
دیوان جان صاحب مجلد تیز۲ روپیه
دیوان درد ۱ روپیه ۴ آنه
دیوان غالب (لائبریری ایڈیشن)
۱ روپیه ۸ آنه
خطوط سر سید قسم اول ۳ روپیه
خطوط سر سید قسم دوم ۲ روپیه
لیتھو گرافی مجلد ۲ روپیه ۸ آنه
انتخاب زریں مجلد ۲ روپیه
مراثی انیس جلد اول مجلد
۱۰ روپیه
مراثی انیس جلد دوم قسم اول
۸ روپیه قسم دوم ۴ روپیه
تذکرۃ الصلحا ۸ آنه
کنز التاریخ ۱ روپیه ۸ آنه
قصائد ذوق ۳ روپیه

(دائرۂ ادبیه - لکھنؤ)

یادگار غالب مجلد ۳ روپیه
مکاتیب امیر مینائی ۲ روپیه ۸ آنه
مکاتیب اکبر ۱ روپیه
مینائے سخن ۱ روپیه
حزنِ اختر ۸ آنه
درس عمل ۴ آنه
خواتین انگورہ ۱ روپیه
بیگمات بنگال ۶ آنه
اسلام کا اثر یورپ پر ۴ آنه
مشرقی ترکستان ۶ آنه
سیاحت زمین ۱ روپیه
سیاحت ہوا ۱ روپیه

الناظر پریس - لکھنؤ

فلسفیانه مضامین عبدالماجد صاحب
۱ روپیه ۸ آنه
تاریخ عرب مجلد ۷ روپیه
موازنۂ انیس و دبیر غیر مجلد ۳ روپیه
مقدمۂ شعر شاعری ۱ روپیه ۴ آنه
اصول النسخ ۶ آنه
مسلمانانِ اندلس ۱ روپیه
اسرار رنگون ۱ روپیه
ہوم رول ۵ آنه
خوان دعوت ۱ روپیه
مصنوعی شوہر ۲ آنه
وکرم اروسی ۱ روپیه ۸ آنه
مسلمانوں کی تہذیب ۶ آنه
الاحسان ۸ آنه
ارض نہریں ۴ آنه
تذکرۂ حزیں ۴ آنه
حیات نظامی ۴ آنه
خطاب ۴ آنه

میلاد نبوی ۴ آنہ
تصویر درد ۴ آنہ
شمع و شاعر ۲ آنہ
فریاد اُمت ۳ آنہ

(دار الاشاعت پنجاب - لاہور)

صبح زندگی ۱ روپیہ ۸ آنہ
شام زندگی ۱ روپیہ ۴ آنہ
شب زندگی ہر دو حصہ ۲ روپیہ ۴ آنہ
منازل السائرہ ۱ روپیہ
سنجوگ ۱۰ آنہ
جوہر قدامت ۱ روپیہ ۸ آنہ
تحفۂ سائنس ۲ روپیہ ۸ آنہ
مشاہیر ہند ۲ روپیہ ۸ آنہ
نیلی چھتری ۱ روپیہ ۴ آنہ
بہرام کی گرفتاری ۱ روپیہ
اختر النسا بیگم ۱ روپیہ ۸ آنہ
روشنک بیگم ۲ روپیہ
رانی کرونارت ۱ آنہ
رسوم دہلی ۴ آنہ ۶ پائی
ان پورنا دیوی کا مندر ۱ روپیہ ۸ آنہ
ایام غدر ۱ روپیہ ۴ آنہ
نقش فرنگ ۱ روپیہ ۴ آنہ
پریم پچیسی مکمل ۳ روپیہ
پریم بتیسی حصۂ اول ۱ روپیہ ۸ آنہ
بانگ درا مجلد ۵ روپیہ ۸ آنہ
بانگ درا غیر مجلد ۴ روپیہ
نعمت خانہ ۱ روپیہ ۴ آنہ
چلتن ہار ۲ آنہ
انمول موتی ۱ آنہ ۹ پائی
سوکن کا جلاپا ۶ آنہ

گوہر مقصود ۹ آنہ
لیلیٰ ۲ روپیہ
سواء السبیل ۱ روپیہ
سخندان پارس ۱۰ آنہ
قوانین دولت ۴ آنہ
مینا ۱۲ آنہ
چترا ۱۲ آنہ
امتیاز پچیسی ۸ آنہ
دلپسند کہانیاں ۱۲ آنہ
دلچسپ کہانیاں ۱۰ آنہ

(تصانیف نور الٰہی و محمد عمر صاحبان)

موجودہ لندن کے اسرار ۱ روپیہ
ناٹک ساگر (یعنی دنیائے ڈراما کی تاریخ)
مجلد ۳ روپیہ
تین ٹوپیاں ۸ آنہ
ظفر کی موت ۴ آنہ
قزاق ۸ آنہ
بگڑے دل ۸ آنہ

(دوسری قابل قدر کتابیں)

رسائل شبلی ۱ روپیہ ۸ آنہ
کتب خانۂ اسکندریہ ۵ آنہ
بادل کے بچے ۱ روپیہ
مجموعۂ نظم حالی ۸ آنہ
اکبری اقبال ۳ آنہ
الفاروق ۳ روپیہ
اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر
۸ آنہ
پردۂ غفلت ۱ روپیہ ۸ آنہ
بشریٰ ۶ آنہ
ذکریٰ ۱۰ آنہ

نیرنگ ارض ۱ روپیہ ۴ آنہ
سیر المصنفین ۲ روپیہ
Hindustani Simplified (اُردو آموز)
دنیش چندر دت صاحب ایم اے ۳ روپیہ
شرح Hindustani Simplified ۱ روپیہ
رسالۂ نماز Prayer Book ۱ روپیہ
معراج العاشقین ۶ آنہ
ابتدائی تعلیم کی رام کہانی ۱ روپیہ
ہندو تیوہاروں کی اصلیت اور اُن کی
جغرافیائی کیفیت ۸ آنہ
وہ جاندار جو نظر نہیں آتے ۴ آنہ
جہاں آرا بیگم ۸ آنہ
نظم شبلی ۴ آنہ
نفس اللغہ ۱ روپیہ
خوبی سخن ۸ آنہ

دیگر ممالک میں قطع تعلق ۱۰ آنہ
آزادیٔ اسلام ۴ آنہ
مصطفی کمال پاشا ۱ روپیہ ۸ آنہ
گوکھلے کی تقریریں ۱۲ آنہ
سلف گورنمنٹ ۶ آنہ
عالم خیال ۸ آنہ
حیات خسرو ۸ آنہ
نظام حیات انسانی ۸ آنہ
فرہنگ فارسی جدید ۱ روپیہ ۸ آنہ
فرہنگ عربی جدید ۱ روپیہ ۸ آنہ
اسلامی حکومت ۲ آنہ
تمدن ہند ۲۰ روپیہ
ترجمہ خلاصہ تاریخ انگلستان ۹ روپیہ
۸ آنہ

———:o:———

دیوان غالب جدید و قدیم

یہ وہ نایاب کلام ہے جس کی اشاعت کا اہل ملک کو بیحد انتظار تھا - اس میں مرزا غالب کا قدیم و جدید تمام کلام موجود ہے - میرزا صاحب کا قدیم کلام ملنے کی کسے توقع تھی - یہ محض حسن اتفاق تھا کہ ہاتھ آگیا اور اب ریاست بھوپال کی سر پرستی میں چھپ کر شائع ہوا ہے - مع مقدمۂ ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری مرحوم مجلد ۵ روپیہ کلدار - غیر مجلد ۴ روپیہ کلدار (بلا مقدمہ مجلد ۳ روپیہ ۸ آنہ کلدار غیر مجلد دو روپیہ ۸ آنہ کلدار) —

اطلاع

رسالۂ اُردو کے نمبر ۲ سے نمبر ۲۰ تک موجود ہیں اور بہ حساب فی رسالہ دو روپیہ سکۂ انگریزی علاوہ محصول ڈاک مل سکتے ہیں —

المشتہر
انجمن ترقی اُردو - اورنگ آباد (دکن)

رسالۂ اُردو کے خریداروں کے ساتھہ خاص رعایت

رسالۂ اُردو کے خریداروں کو انجمن ترقی اُردو کی شایع کی ہوئی کتابیں فی روپیہ چارآنہ کمی قیمت کے ساتھہ دی جائیں گی۔ اُمید ہے کہ ناظرین اس رعایت سے فائدہ اُتھائیں گے —

دیگر مقامات کی کتابیں جو بطور ایجنسی انجمن میں فروخت ہوتی ہیں، ان کی قیمتوں میں کوئی کمی نہیں کی جاسکتی —

آنریری سکریٹری

انجمن ترقی اُردو - اورنگ‌آباد (دکن)

حقیقت اسلام

یہ کتاب جناب نواب سر امین جنگ بہادر، کے - سی - آئی، ای، سی، ایس - آئی، ایم - اے، بی - ایل، ایف، آر - ایس چیف سکریٹری گورنمنت نظام و صدرالمہام پیشی کی بے نظیر تصنیف نوٹ آن اسلام کا با محاورہ اور سلیس ترجمہ ہے - اس کتاب میں مصنف نے نہایت خوبی کے ساتھہ موجودہ خیالات سائنس سے اسلام کی تطبیق اور اس کی صداقت کا بیان کیا ہے - فاضل مصنف نے اُن تمام مشکل مسائل کی حقیقت کو جن میں اکثر تعلیم یافتہ نوجوانوں یا غیر مسلموں کو شبہات واقع ہوتے ہیں، زمانۂ حال کے ترقی یافتہ خیالات کی روشنی میں نہایت دلاویز طریقے اور حکیمانہ استدلال سے بیان کیا ہے - جس سے مصنف ممدوح کے وسیع مطالعہ، فلسفیانہ طبیعت اور غور و خوض کا پتہ ملتا ہے —

کتاب بہت عمدہ کاغذ پر مجلد چھپی ہے - انجمن سے ۱۲ آنہ (کلدار) میں مل سکتی ہے —

المشتہر

انجمن ترقی اُردو اورنگ‌آباد (دکن)